حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں

محمد عبداللہ قریشی

☆

بزمِ اقبال ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں

محمد عبداللہ قریشی

☆

بزمِ اقبال ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : مئی ۱۹۸۲ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
اعزازی سیکرٹری بزمِ اقبال ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

قیمت : ۴۰ روپے

ترتیب

عکس خط جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال ۷
پیش کلام ، از احمد ندیم قاسمی ۹
احوالِ واقعی ـــــ محمد عبداللہ قریشی ۱۳
(۱) **جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست** ۱۷
کشمیری الاصل - برہمنوں کی سپرو گوت - اجداد - والدین -
(۲) **لاہور کے مشاعرے** ۴۳
مولانا فیض الحسن سہارنپوری ۴۷ - میرزا ارشد گورگانی ۵۲ - میر ناظر حسین ناظم لکھنوی ، شیخ الٰہی بخش رفیق ۶۰ - انجمن اتحاد کے مشاعرے ۶۶ - مولانا عبدالحکیم کلانوری ۸۰ - مفتی عبداللہ ٹونکی ۸۰ - شیخ عبدالقادر ۸۱ - چودھری شہاب الدین ۸۲ - مولوی احمد دین ۸۴ - شیخ گلاب دین ، مولوی محمد حسن جالندھری ، مولوی محمد حسین ۸۷ - میاں محمد شفیع ۸۸ - ایک یادگار تقریب ۹۰ - لٹریری سوسائٹی ۹۳ - بزمِ قیصری ۹۵ - نظموں کا سلسلہ ۹۷ - انجمن مشاعرہ کی نشاۃِ ثانیہ ۹۸ - اقبال کے ساتھی ـــــ (۱) منشی محمد الدین فوق ۱۰۰ - میر جالب دہلوی ۱۰۱ - (۲)

آغا شاعر قزلباش دہلوی ۱۰۲ - (۴) احسن مارہروی ۱۰۴ - (۵) پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی ۱۰۶ - (۶) منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی ۱۰۷ - (۷) میر غلام بھیک نیرنگ ۱۰۹ - (۸) تارا چند تارا ۱۱۱ - (۹) عبدالمجید ازل ۱۱۳ - (۱۰) پیر وزیر علی شاہ حامی ۱۱۵ - (۱۱) میر نثار علی شہرت دہلوی ۱۱۶ - (۱۲) بابو بہاری لال شفق ۱۱۷ - مشاعروں کا خاتمہ ۱۱۷ - جدید مشاعرہ ۱۲۰ - مشاعرہ چمن سخن ۱۲۰ - مشاعرہ بھارت سبھا ۱۲۰ - انجمن سخن کے مشاعرے ۱۲۳ - بزمِ اردو ۱۲۵ - حشر کی آمد ۱۲۷ - تبصرہ ۱۲۹ - بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی ۱۳۱ -

(۳) انجمنِ کشمیری مسلمانان ۱۳۳

اغراض و مقاصد ۱۳۶ - اقبال کی پہلی نظم ۱۳۶ - اقبال کے قطعات ۱۳۹ - سیکریٹری کے عہدے پر تقرر ۱۴۲ - نواب سر سلیم اللہ خاں کی خدمت میں سپاسنامہ ۱۴۳ - سپاس نامے کا جواب ۱۴۶ - کشمیریوں کے فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں حکومت سے سوال و جواب ۱۴۷ - فوجی ملازمت ، زمینداری اور مردم شماری کا مسئلہ ۱۵۱ - کشمیری کانفرنس کا پہلا وفد مہاراجہ کشمیر کی خدمت میں ۱۵۷ - دوسرا وفد ۱۵۸ - وفد میں اقبال کی شمولیت ۱۶۰ - عالمگیر اخوت کے نصب العین کی خاطر برادری کی انجمن سے علیحدگی ۱۶۲ -

(۴) اقبال کا تعلیمی سفر ۱۶۷

اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کی ابتدا ۱۶۹ - ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان مقابلہ میں ناکامی ۱۷۰ - پروفیسر آرنلڈ کی انگلستان کو روانگی ۱۷۱ - اقبال کا عزمِ انگلستان ۱۷۲ - دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری ۱۷۳ - دہلی سے بمبئی اور وہاں سے ملوجا جہاز کے ذریعے لندن کو روانگی ۱۷۵ - سفر کے دلچسپ حالات ۱۷۵ - سفر کی مزید کیفیات ۱۹۳ - کیمبرج میں داخلہ ۲۰۲ - قیام و طعام ۲۰۳ - اساتذہ ۲۰۵ - ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ۲۰۶ - جرمنی کے متعلق تاثرات ۲۰۷ - تقریروں کا سلسلہ ۲۰۸ - استادوں کے ساتھ تعلقات : ڈاکٹر آرنلڈ ۲۰۹ - ڈاکٹر براؤن ۲۱۲ - پروفیسر الیگزنڈر ۲۱۳ - پروفیسر میک ٹیگرٹ ۲۱۵ - پروفیسر مارلے اور پروفسر نکلسن ۲۱۷ - ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے ۲۲۰ - مس عطیہ فیضی ۲۲۵ - شیطان کے چیلے ۲۲۶ - بدھ مت ۲۲۷ - عیسائی مبلّغ ۲۲۸ - مراجعت ۲۳۰ - ترانۂ مسرت ۲۳۲ - لاہور میں استقبال ۲۳۳ - علی گڑھ کی پیشکش ۲۳۵ -

(۵) اقبال اور فوق ۲۴۱

دوستی کی ابتدا ۲۲۲ - فوق کے کاروبار میں دلچسپی کا اظہار ۲۴۷ - پنجۂ فولاد کا تعارف ۲۴۹ - امتحان میں پاس ہونے کا گُر ۲۵۲ - بہار گلشن میں اقبال کی غزلیں ۲۵۳ - شالامار باغ کی سیر ۲۵۸ - یاد رفتگاں

۲۵۹ - کلامِ فرق ۲۶۱ - رہنمائے کشمیر ۲۶۲ - تاریخِ حریتِ اسلام ۲۶۳ - اسلام میں سیاست ۲۶۶ - سوانح علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ۲۶۷ - شبابِ کشمیر ۲۷۱ - فوق صاحب کی بیوی کے انتقال پر تعزیت - اقبال کی بیماری اور انتقال ۲۷۲ -

(٦) **اقبال اور طریقت** ۲۷۵

اولیا سے عقیدت ۲۷۷ - پیشہ ور صوفیوں سے نفرت ۲۷۸ - رسالۂ طریقت کا اجراء ۲۸۰ - تصوف کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیالات ۲۸۱ - پیر جماعت علی شاہ کا ورودِ کشمیر ۲۸۸ - وجدانی نشتر ۲۹۳ - مثنوی اسرارِ خودی کی بحث ۲۹۶ - رسالہ نظام کا اجراء اور اقبال کا غیر مطبوعہ کلام ۳۰۱ -

(۷) **اقبال اور کشمیر** ۳۰۳

کشمیر جانے کے اسباب ۳۰۵ - مقدمات کی پیروی کے بعد کشمیر کی سیر کا لطف ۳۱۱ - کشمیر سے واپسی ۳۱۳ - "پیامِ مشرق" کی تین نظمیں : کشمیر ، غنی کشمیری اور ساقی نامہ ۳۱۳ - ادبیاتِ کشمیر ۳۲۰ - لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ۳۲۱ - سید علی ہمدانی اور "ملا" غنی سے روحانی ملاقات ۳۲۳ - تحریک کشمیر ۳۲۹ - کشمیر کمیٹی کی صدارت ۳۳۲ - کشمیر کی زبوں حالی پر تڑپ اٹھنے کی وجہ ۳۴۱ -

(۸) **عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں** ... ۳۵۱

فرمائش کرنے والا کون تھا ؟ کن حالات میں یہ نظم لکھی گئی ؟ گمشدہ اوراق کی تلاش -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۷ گارڈن روڈ

لاہور ۱۲ ، ۸۲ء

۱۳ دسمبر

JUDGE

محترمی و مکرمی جناب محمد عبداللہ قریشی صاحب۔ سلام مسنون۔

آپ کا خط مل گیا۔ بہت بہت شکریہ۔

میں نے "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" کے سلسلے میں آپ کے مضامین مہر کے شاعر، اقبال کشمیری مسلمانوں، اقبال کا تعلیمی سفر، اقبال کا ذوق، اقبال اور کشمیر وغیرہ سب پڑھے ہیں اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ میرے لیے یہ بات قابل مسرت ہے کہ آپ نے اس عہد کی بہت ساری اہم چیزوں کو محفوظ کر لیا ہے اور یہ تمام مسالہ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام دے گا۔ علامہ اقبال پر لکھا تو بہت کچھ جا رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہم محنت اور لگن سے کوئی علمی کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ تحقیق ایک محنت طلب کام ہے۔ اور آپ نے جس جانفشانی سے یہ کام کیا ہے، میں اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خیر اندیش

جاوید اقبال

پیش کلام

جناب محمد عبداللہ قریشی نے حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیوں کو مضامین کی صورت میں جمع کرنے کا سلسلہ ۱۹۵۲ع میں شروع کیا تھا ۔ اب اس سلسلۂ مضامین کو تیس برس ہو رہے ہیں مگر یہ حقیقت کتنی دل خراش ہے کہ بزمِ اقبال کے مجلہ ''اقبال'' اور اقبال اکیڈمی کے مجلہ ''اقبال ریویو'' کے سے معروف اور اہم علمی رسائل میں ان مضامین کی اشاعت کے باوجود ، علامہ اقبال کے سوانح نگار ان مضامین کے مندرجات سے بڑی حد تک بے خبر یا بے نیاز رہے ۔ انھوں نے اس دور کے ایک نامور مورخ اور محقق کی جمع کی ہوئی قیمتی معلومات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا ۔ ستم یہ ہے کہ اگر کسی نے ان مضامین سے استفادہ بھی کیا تو اس نے اعتراف و حوالہ سے گریز کیا ۔ صرف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے حال ہی میں نہایت فراخ دلی سے ان مضامین کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کیا ہے ۔ ساتھ ہی بزمِ اقبال کی طرف سے جناب محمد عبداللہ قریشی سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے ان بکھرے ہوئے مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں سمیٹیں اور اس طرح علامہ اقبال کے مستقبل کے سوانح نویسوں کا کام آسان کردیں ۔

سوانح نگاروں کو اپنے موضوع کے مزاج و کردار اور افکار و اعمال کی سچی اور کھری تصویریں ان کے نجی خطوط سے بیش از بیش

دستیاب ہوتی رہی ہیں اور حیاتِ اقبال کے واقعات کی ترتیب میں علامہ کے خطوط سے خاصی مدد لی گئی ہے مگر اس ضمن میں علامہ کے عہد میں شائع ہونے والے اخباروں اور رسالوں کی اہمیت کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ رسالوں میں علامہ کے اشعار و مضامین شائع ہوتے رہے اور اخباروں میں ان کے بیانات اور علمی فتوحات کے سلسلے میں ان کی سرگرمیوں کی تفاصیل درج ہوتی رہیں ۔ علامہ کا کوئی بھی سوانح نگار معلومات کے ان خزانوں کو نظر انداز کرکے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ ان معلومات کی اہمیت اس لحاظ سے دو چند ہو جاتی ہے کہ یہ معلومات عموماً نہایت بے لاگ اور سچی ہوتی ہیں کیونکہ جو کچھ بھی ہمیں ان رسالوں اور اخباروں میں درج ملتا ہے ، اس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ علامہ کی نظروں سے گزر چکا ہے اس لیے صحیح ہے ۔ مگر تعجب کا مقام ہے کہ حیاتِ اقبال سے متعلق اکثر کتابوں میں مصنفین نے معلومات کے ان خزانوں سے فائدہ اٹھانے کی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی ۔ یہ اعزاز جناب محمد عبداللہ قریشی کو حاصل ہوا ہے کہ وہ ان قدیم دفینوں میں سے قیمتی موتی نکال لائے ہیں اور ان موتیوں کی آب سے علامہ کی زندگی کے بعض دھندلے گوشے چمک اٹھے ہیں ۔

عظیم شخصیتوں کی زندگی صرف چند اہم واقعات پر مشتمل نہیں ہوتی ۔ ان شخصیتوں کی روزمرہ زندگی کی جزئیات کے مطالعے سے اجتناب برتنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ شخصیتیں مکمل صورت میں مطلوب نہیں ہیں ۔ دراصل جزئیات کی تلاش کے لیے بڑی تحقیقی کاوش درکار ہوتی ہے اور اس کاوش کا چلن فی زمانہ ناپید ہو چلا ہے ۔ محمد عبداللہ قریشی کے سے اکا دکا محققین کا دم غنیمت ہے کہ وہ ہر علمی مسئلے کی گہرائیوں میں اتر جانے پر مصر رہتے ہیں ۔

زیرِ نظر کتاب کے مندرجات کے حوالے ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ مضامین یک جا نہ کیے جاتے اور یہ کتاب مرتب نہ ہوتی تو کشمیری مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے سلسلے میں علامہ اقبال کی عملی جد و جہد کا پہلو کتنا تشنہ رہتا ۔ مصنف نے ''انجمن کشمیری مسلمانان'' ، ''اقبال اور فوق'' اور ''اقبال اور کشمیر'' کے ابواب میں اس تشنگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے ۔ صرف ان تین ابواب ہی نے حیاتِ اقبال کی کتنی اہم گم شدہ کڑیاں فراہم کر دی ہیں ۔ یہ بات نہیں کہ مسلمانانِ کشمیر کے مسائل سے علامہ اقبال کی دلچسپی کا اب تک کہیں ذکر نہ آیا ہو ۔ مجھے صرف یہ نکتہ واضح کرنا ہے کہ اتنی تفصیل اور اتنے معتبر حوالوں کے ساتھ اب تک اس مسئلے کا ذکر نہیں کیا گیا تھا ۔

اسی طرح لاہور کے مشاعروں میں علامہ کی شرکت کی تفصیل پڑھ کر ابتدا ہی میں ایک بڑی شخصیت کی ذہانت و فطانت کی چمک صاف دکھائی دیتی ہے ۔ ساتھ ہی قارئین کو اس شخصیت کے تدریجی فنی ارتقاء کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ ''اقبال اور طریقت'' کا باب بھی علامہ کے عقائد کے بعض پہلوؤں کے بارے میں ہمیں نئی مگر مستند معلومات فراہم کرتا ہے ۔ بعینہٖ دیگر ابواب میں بھی علامہ کی زندگی کے بعض دھندلے گوشوں کو روشن کیا گیا ہے مگر کسی ایک مقام پر بھی محض سنی سنائی پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ ہر واقعے کے لیے علامہ کے خطوط اور مختلف اخباروں اور رسالوں کے حوالے موجود ہیں ۔

جناب محمد عبداللہ قریشی کی اس کتاب کا مطالعہ میرے لیے اس لیے بھی دلاویز رہا کہ اس کے ہر باب میں حیاتِ اقبال کے سلسلے میں متعدد نئے سے نئے انکشافات ہیں ، اور ہر انکشاف کی حیثیت

اُس دریچے کی سی ہے جس میں سے روشنی اور تازہ ہوا کا ایک ریلا سا آئے اور دل و دماغ میں اُتر جائے۔ اس پر مستزاد مصنف کا اسلوبِ تحریر ہے کہ علمی تحقیق کی کم ہی کتابوں میں اتنی سادگی، سلاست اور بے تکلفی سے مسائل کی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں۔

مجھے اُمید بلکہ یقین ہے کہ جناب محمد عبداللہ قریشی کی اس تصنیف کو اقبالیات میں ایک اہم اضافہ تسلیم کیا جائے گا اور حیاتِ اقبال کو اپنا موضوع بنانے والوں کے لیے آئندہ اس کتاب سے استناد ناگزیر ہو جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی

بزمِ اقبال، لاہور

۸ - اپریل ۱۹۸۲ء

احوالِ واقعی

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے پہلی اردو کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ایک علمی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا ۔ یہ علمی نمائش دو شعبوں پر مشتمل تھی ۔ ایک شعبے میں قدیم و جدید قلمی اور مطبوعہ کتابیں رکھی گئی تھیں اور دوسرے شعبے میں اردو کے قدیم و جدید اخبار و رسائل سجائے گئے تھے ۔ اخبار و جرائد والی کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر برکت علی قریشی مرحوم تھے ۔ اراکین میں مولانا عبدالمجید خاں سالک مدیر روزنامہ انقلاب لاہور اور میں شامل تھے ۔ مولانا سالک مرحوم نے تو اخبار انقلاب کے دفتر میں آنے والے تمام تازہ اخبار اٹھا کر نہایت آسانی سے کمیٹی کے حوالے کر دیے مگر میرے سپرد پرانے اخباروں اور رسالوں کی جمع و تلاش کا مشکل کام تھا ۔ میں نے لاہور کے معروف علمی گھرانوں اور اخباروں کے دفتروں میں جا جا کر اور ان کے گوداموں کی خاک چھان کر کوئی چھ سو کے قریب نمونے جمع کیے جو اس نمائش کی زینت بنے :

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

اس نمائش کا افتتاح ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈاکٹر مولوی محمد شفیع سابق پرنسپل اوریئنٹل کالج لاہور نے کیا ۔ معزز مہمانوں

میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم بھی تھے جنھوں نے تعارف کے بعد میری محنت کی دل کھول کر داد دی ۔

اس نمائش کا مقصد تو یہ تھا کہ اردو سے محبت رکھنے والے ایک ہی نظر میں دیکھ سکیں کہ تصنیف و تالیف اور صحافت کے میدان میں اردو کس حد تک ترقی کر چکی ہے اور اس کا دامن کہاں تک وسیع ہے ۔ اس میں سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے کتنا کام ہوا ہے اور کیا کچھ ابھی توجہ طلب ہے ۔ مگر مجھے دو چیزوں نے بہت متاثر کیا ۔ ایک تو یہ کہ پورے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں شائع ہونے والے اخبار و رسائل کے مقابلے میں صرف پنجاب سے نکلنے والے اخباروں کا پلہ بھاری تھا ۔ دوسرے یہ کہ پنجاب کے اخباروں اور رسالوں میں علامہ اقبال کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات کا ایک ذخیرہ دفن تھا ۔ یہ واقعات اور حقائق ایسے تھے کہ ان تک اقبال کے سوانح نگاروں کی رسائی نہیں ہوئی تھی ۔

نمائش سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ان اخباروں کی گرد جھاڑی ، ان کی ورق گردانی کی اور ان میں ڈوب کر ایسے ایسے موتی نکالے کہ جوہری پھڑک اٹھے ، مگر میں نے جھولیاں بھر بھر کے لٹا دیے ۔ باقیاتِ اقبال ، مکاتیبِ اقبال بنامِ گرامی ، معاصرین اقبال کی نظر میں ، روحِ مکاتیبِ اقبال اور زیرِ نظر کتاب میری اسی قسم کی کاوشوں کا حاصل ہے ۔

جن دنوں میں ''حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں'' تلاش کر رہا تھا ، میرے عزیز اور فاضل دوست بشیر احمد ڈار مرحوم اقبال کے فلسفۂ اجتماع پر ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہے تھے ۔ وہ اس وقت وطن اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس تھے ۔ یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو علامہ اقبال کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد مثنوی

رموزِ بے خودی کی روشنی میں اقبال کے عمرانی فلسفے پر ظہور میں آئی تھی - یہی کتاب ان کی آئندہ زندگی کا مقدمۃ الجیش ثابت ہوئی -

۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور پروفیسر ایم ایم شریف کی سربراہی میں بزمِ اقبال اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ قائم ہوئے - انھوں نے بشیر احمد ڈار کو فیلو منتخب کرکے ماہنامہ 'ثقافت' اور سہ ماہی مجلہ 'اقبال' کی ادارت میں اپنا معاون بنا لیا - ابھی 'اقبال' کا ایک ہی پرچہ شائع ہوا تھا کہ ڈار مرحوم سرِ راہ ملے اور انھوں نے مجھے اس میں لکھنے کی دعوت دی - میں نے نمونے کے طور پر ایک مقالہ ''معرکۂ اسرارِ خودی'' پیش کیا ، جسے مجلس ادارت نے پسند کرکے دو قسطوں میں شائع کیا - یہ مضمون خود معرکہ آرا ثابت ہوا اور اس نے علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کی - خدا نے چاہا تو بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ یہ عنقریب علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگا -

اس کے بعد ڈار صاحب نے مجھے اور مضامین لکھنے پر اکسایا ، جو میں نے لکھے اور وہ اپنے اپنے وقت پر شائع ہو کر میری عزت اور شہرت کا باعث بنے - مجھے اعتراف ہے کہ بشیر احمد ڈار مرحوم کی ترغیب سے یہ گم شدہ اوراق منظرِ عام پر آئے ، محبی احمد ندیم قاسمی کی توجہ سے ایک سر رشتے میں منسلک ہو کر کتاب بنے ، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے فروغ دینے سے ان کا اقبال بلند ہوا اور اب انشاء اللہ یہ حیاتِ جاوید حاصل کریں گے -

لاہور - ۱۲ اپریل ۱۹۸۲ء　　　　محمد عبداللہ قریشی

جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اقبال علیہ الرحمۃ کشمیری الاصل تھے اور ان کا خمیر کشمیر کے آب و گل سے اٹھایا گیا تھا ۔ چنانچہ وہ خود بھی کہتے ہیں[1] :

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

ایک اور جگہ فرماتے ہیں[2] :

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنّت نظیر ہے

ان کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے ۔ اقبال کہتے ہیں[3] :

موتی عدن سے ، لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا وطن سے دور

۱- راقم کا ایک مضمون ''حیات اقبال کا ایک پہلو'' ۱۰ اور ۱۱ مارچ ۱۹۵۳ع کے روزنامہ ''امروز'' لاہور میں شائع ہوا تھا ۔ اس کے بعض نکات یہاں پس منظر کے طور پر دیے گئے ہیں ۔

۲- ۳- باقیات اقبال ، ص ۳۲ ۔

یہ بھی بہتوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے اسلاف برہمن تھے اور کشمیری پنڈتوں کی سپرو گوت سے تعلق رکھتے تھے۔ "جن کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کسی کو انکار نہیں اور غالباً از روئے قانونِ توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملا تھا[1]۔"

اقبال اگرچہ ذات پات اور رنگ و نسل کے امتیازات کو جائز نہیں سمجھتے تھے، لیکن ان کے کلام میں جگہ جگہ اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں جن میں انھوں نے اپنے برہمن زادہ ہونے کا اقرار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست

اور اس میں شک بھی نہیں کہ "ایشوری گیان اور کلامِ ربانی کو برہمن زادہ ہی سمجھ سکتا ہے اور اس میں اقبال نے کیا راز پنہاں کیا ہے؟ (یہی کہ) اقبال کشمیری پنڈت تھے۔ ہزاروں برس تک

۱۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: "اقبال کی زندگی" مندرجہ کتاب "آثارِ اقبال"، ص ۱۸۔

ان کے آباؤ اجداد نے روحانیت کی تربیت میں اقبال کو اپنے اندر پرورش کیا ۔"[1]

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کشمیر کے ہر دلعزیز سلطان زین العابدین عرف بڈ شاہ[2] کے عہد (تخت نشینی ۸۲۴ھ - وفات ۸۷۴ھ) سے پیشتر کشمیر کے برہمن مسلمانوں کو اور ان کی زبان کو اجنبی خیال کرتے تھے لیکن بڈشاہ نے انھیں خاص مراعات عطا کیں اور نظم و نسق سلطنت میں شامل کرنے کے لیے حکومت کی سرکاری زبان فارسی پڑھنے پر آمادہ کیا ۔ چنانچہ برہمنوں کے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان میں مہارت تامہ حاصل کی وہ "سپرو" کہلایا ۔ کشمیر میں پڑھنے کو اب بھی "پرنا" کہتے ہیں ۔ "سپر" کا مطلب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے سب کچھ پڑھ لیا ۔ "سپرو" اس لڑکے کو بھی کہتے ہیں جو چھوٹی سی عمر میں بڑوں کی سی ذہانت دکھائے ۔ واؤ تقریباً ہر نک نیم یا ال کے ساتھ یونہی لگا دی جاتی ہے ، جیسے کچل سے کچلو بنا ، ہنڈ سے ہنڈو ، من وٹ سے من وٹو یا منٹو ، مٹھ یا مٹ سے مٹو ، نہر سے نہرو ، ونچ سے وانچو اور وانٹ سے وانٹو وغیرہ ۔ اسی طرح "سپر" سے سپرو مشہور ہو گیا ۔

سپرو کی وجہ تسمیہ اقبال کے ایک خط سے بھی معلوم ہوتی ہے جو انھوں نے ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ع کو منشی محمد الدین فوق کے نام لکھا تھا ۔ منشی صاحب موصوف اس وقت اپنی کتاب تاریخ

۱- پنڈت رام چندر دہلوی : (مشہور مذہبی مناظر و فاضل عربی و سنسکرت) مضمون روزنامہ احسان لاہور ، اقبال نمبر ، ۲۷ جون ۱۹۳۸ع -

۲- بڈ کشمیری زبان میں بڑے کو کہتے ہیں - بڈ شاہ کے معنی ہیں بڑا بادشاہ یا بادشاہ اعظم -

اقوامِ کشمیر[۱] لکھ رہے تھے ۔ آپ نے اقبال کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا جس کے جواب میں اقبال نے فرمایا :

"ڈیر فوق صاحب !

مجھے معلوم نہیں کہ سپرو کے معانی کشمیری زبان میں کیا ہیں ؟ البتہ کشمیری برہمنوں کی جو گوت "سپرو" ہے ، اس کی اصل کے متعلق میں نے جو کچھ اپنے والد مرحوم سے سنا تھا ، وہ عرض کرتا ہوں ۔

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو برہمنِ کشمیر مسلمانوں کے علوم و زبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے ۔ اس قوم میں سب سے پہلے جس گروہ نے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کرکے حکومت اسلامی کا اعتماد حاصل کیا ، وہ "سپرو" کہلایا ۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے یا جس نے سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا ۔ "س" تقدم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے اور "پرو" کا روٹ وہی ہے جو ہمارے مصدر "پڑھنا" کا ہے ۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے بھائی بندوں کو از راہِ تعریض و تحقیر دیا تھا ، جنھوں نے قدیم رسوم و تعلقاتِ قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے

۱۔ تاریخ اقوام کشمیر تین جلدوں میں ہے ۔ دو جلدیں تو فوق صاحب کی زندگی چھپ گئی تھیں ، تیسری ان کی وفات (۱۴ اگت ۱۹۴۵ع) کے بعد راقم الحروف نے مرتب کرکے شائع کی ۔

اسلامی زبان و علوم کو سیکھنا شروع کیا تھا ۔ رفتہ رفتہ
یہ نام ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا ۔
دیوان ٹیک چند ایم ۔ اے ، جو پنجاب میں کمشنر تھے ،
ان کو تحقیقِ لسان کا بڑا شوق تھا ۔ ایک دفعہ انبالہ میں
انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ لفظ ''سپرو'' کا تعلق ایران
کے قدیم بادشاہ شاپور سے ہے اور سپرو حقیقت میں ایرانی
ہیں ، جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر
میں آباد ہوئے اور اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے
برہمنوں میں شامل ہو گئے ۔ واللہ اعلم
پنجاب میں جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی گھر مسلمان
سپرو خاندان کا نہیں ہے ۔ اعجاز[1] احمد کی شادی کے
وقت اس امر کی جستجو کی گئی تھی مگر ناکامی ہوئی ۔
محمد اقبال''

۱۶ جنوری ۱۹۳۴ع

اس خط کو پڑھنے کے بعد جب ہم ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی تحقیقات میں تقریباً اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کے زمانے میں کشمیر کے ہندوؤں میں فارسی سیکھنے کا آغاز ہوا اور سپرو پنڈتوں نے پہلے پہل اس میدان

۱۔ شیخ اعجاز احمد بی ۔ اے ، ایل ۔ ایل ۔ بی اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے فرزند ہیں ۔ قیامِ پاکستان سے قبل اول سول جج ، پھر مرکزی محکمۂ خوراک کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے ۔ آخر میں پاکستان سول سروس سے ریٹائر ہوئے ۔ اقبال نے انھیں اپنی جائداد کا ٹرسٹی بھی مقرر کیا تھا ۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں ۔

میں قدم رکھا۔[1] پنڈت کاچرو کی تصنیف "مجمع التواریخ[2]"، کتاب "سہاتمنی کشمیرہ منڈل[3]" اور کرپا رام کی کتاب "گلزار کشمیر[4]" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس خط کی آخری چند سطروں سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ اقبال اپنی تمام آزاد خیالی اور وسیع النظری کے باوجود شادی بیاہ کے معاملات میں پرانے بزرگوں کی طرح اپنی برادری سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے اور برادری میں بھی سب سے پہلے اپنے ہم کفو تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی تینوں بیویاں کشمیری الاصل تھیں اور آپ کی دختر منیرہ بانو کی شادی بھی، غالباً آپ کی وصیت کے مطابق، کشمیری خاندان کے ایک صالح نوجوان سے ہوئی۔

اس کی تائید بعض دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اپنے مضمون "علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے" میں لکھتے ہیں:

> "ایک روز محفل جمی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان نے، جو کسی مقامی کالج میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا، کہا "ڈاکٹر صاحب! آپ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذات پات کی تمیز مٹا دینی چاہیے کیونکہ ہماری ذات صرف اسلام ہے۔"

۱- ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۱۰ و ص ۲۳۴، باب برہمنانِ کشمیر۔

۲- مجمع التواریخ (قلمی) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۸۱۔

۳- مملوکہ حافظ محمود شیرانی مرحوم۔

۴- گلزار کشمیر، ص ۱۶۷۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ”بے شک میرا یہی عقیدہ ہے اور میں ہمیشہ اس کی تلقین کرتا ہوں۔“

نوجوان نے کہا ”میں نے سنا ہے کہ خواجہ . . . صاحب کاٹھیاوار کے کسی خاندان میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن آپ نے انہیں منع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ پنجاب کی کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کریں۔“

ڈاکٹر صاحب بے اختیار ہنسے اور کہنے لگے ”بالکل صحیح ہے۔ آپ جانتے ہیں خواجہ . . . صاحب وہاں شادی کر لیں تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہوگی اور اس طرح اس خاندان سے وہ صباحت رخصت ہو جائے گی جو کئی پشتوں سے اس کی خصوصیت چلی آتی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بچے نہایت خوش رو اور سرخ و سپید ہوں تا کہ ہم لوگ صحیح معنوں میں 'ملتِ بیضا' بن جائیں۔“

اس لطیفے پر بے اختیار قہقہہ بلند ہوا اور دیر تک محفل میں خوش طبعی کی رو جاری رہی۔“[1]

الہ آباد (بھارت) ہائی کورٹ کے مشہور وکیل سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر سر محمد اقبال چند پشت اوپر ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اختلافِ مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی مختلف شاخیں ایک دوسری سے کٹ کر علیحدہ ہوگئیں۔[2] سر تیج بہادر سپرو نے الہ آباد سے ایک رسالہ ”کشمیر درپن“ جاری کرکے اپنی

۱۔ عاشق حسین بٹالوی: مضمون ”علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے“ مندرجہ کتاب آثار اقبال، ص ۳۶ - ۳۷ -

۲۔ مولوی عبدالسلام ندوی: اقبالِ کامل و آثار اقبال۔

حب الوطنی کا ثبوت دیا ۔ اقبال کے رگ و ریشے میں بھی کشمیری خون موجزن تھا ۔ ان کی روح بھی وطن کے تیر سے زخمی تھی اور وہ بھی ابنائے وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار تھے ۔ انھوں نے اپنے فکر و عمل سے کشمیر اور اہلِ کشمیر کی ہمیشہ رہبری کی اور پوری انسانیت کے ساتھ ان کے دکھ درد کو بھی اپنا دکھ درد سمجھا اور اس کا اظہار بھی کیا :

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دست جفا کیش کو یارب ، جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
آہ ! یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

سپرو برہمنوں سے تعلق رکھنے کے باوجود بعض تذکرہ نگاروں نے اشارۃً یہ بھی لکھا ہے کہ "ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے والد مرحوم ایک خوش اوقات صوفیِ صافی تھے ۔ ان کے یہاں آنے والے دوستوں کا مذاق بھی

یہی تھا اور اسی ماحول میں اقبال کی پرورش ہوئی۔"[1] مگر کسی نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ وہ صوفی خاندان کون سا تھا اور اقبال کو کس روحانی بزرگ سے نسبت تھی۔ منشی محمد الدین فوق پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس طرف کسی حد تک رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ جب ہم "تاریخِ اقوامِ کشمیر"[2] کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ سراغ ملتا ہے کہ حضرت شیخ العالم نور الدینؒ ولی کشمیری[3] کے ارادت مندوں میں بابا نصر الدین ایک بہت بڑے بزرگ ہوئے ہیں جنھوں نے سلطان زین العابدین بڈشاہ کا زمانہ پایا ہے۔ بابا نصر الدین کے مریدوں میں ایک بزرگ تھے جن کا اصل نام تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن ان کے متعلق "تاریخِ اعظمی"[4] کے صفحہ ۲۷ پر ریشیوں کے باب میں لکھا ہے کہ وہ بارہ سال تک کشمیر سے باہر سیر و سیاحت میں مشغول رہے اور انھوں نے کئی حج کیے۔ اسی وجہ سے بابا لول حج (حج کا دل دادہ) یا لولی حاجی کے نام

۱۔ سید سلیمان ندوی: "اقبال کے پیام کا متن اور شرح" جوہر اقبال، ص ۲۔

۲۔ تاریخ اقوام کشمیر، جلد دوم، صفحات ۳۱۹ - ۳۲۳۔

۳۔ پیدائش ۷۷۰ھ بہ زمانہ سلطان شہاب الدین، وفات ۸۴۲ھ بزمانہ سلطان زین العابدین بڈ شاہ۔

۴۔ "تاریخِ اعظمی" کو "واقعاتِ کشمیر" بھی کہتے ہیں۔ یہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کی تصنیف ہے جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد ۱۱۴۸ھ میں لکھی گئی۔ کئی بار چھپ چکی ہے۔ پہلے امرتسر میں طبع ہوئی تھی، بعد میں لاہور سے۔ پھر سرینگر کشمیر کے مشہور تاجران کتب غلام محمد نور محمد نے شائع کی۔ اس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

اس سلسلے میں ابو محمد محی الدین مسکین کی "تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار" (تاریخ کبیر کشمیر) بھی دیکھی جا سکتی ہے جو ۱۳۱۰ - ۱۳۳۱ھ میں تصنیف ہوئی۔

سے مشہور ہوئے ۔ لولی ، لالہ یا لال کشمیر میں پیار اور عزت کا لفظ ہے ۔ چنانچہ بڑے بھائی کو آج بھی وہاں کاک لال وغیرہ اور بزرگ بوڑھیوں کو لل ماجی یا لل ددی وغیرہ کہتے ہیں ۔ کشمیر میں ایک مجذوبہ بھی ہوئی ہیں جو للہ عارفہ کے نام سے معروف ہیں ۔

بابا لول حج یا لولی حاجی کا وطن پرگنہ اڈون کا موضع چکو تھا ، جو تحصیل کولگام میں واقع ہے ۔ قبولِ اسلام سے قبل وہ ذات کے برہمن تھے ، گوت سپرو اور پیشہ زمینداری تھا ۔ یہ سپرو خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو مسلمان ہوئے ۔ انھوں نے فقر اختیار کرنے کے بعد ملک ملک کی سیر کی اور واپس آ کر پیر کے آستانے کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا ۔ یہاں تک کہ وفات کے بعد بھی چرار شریف میں احاطہ مزار شیخ نور الدین ولیؒ کے اندر اپنے مرشد بابا نصر الدین کے پہلو میں دفن ہوئے ۔ اقبال کو جب اپنے بزرگوں کا ماضی یاد آتا تھا تو کہتے تھے :

بت پرستی کو مرے پیشِ نظر لاتی ہے
یادِ ایامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے !
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

اقبال کا ایک خط جو حال ہی میں دستیاب ہوا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ یہ خط حضرت علامہ نے ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے نام لکھا تھا اور اب موصوف کے فرزند اور اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی تحویل میں ہے ۔ اس سے ہمارے متذکرہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور کئی باتوں پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔ اقبال لکھتے ہیں :

لاہور ، ۵ اکتوبر ۲۵ء

برادر مکرم ، السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے ، جس سے بہت اطمینان ہوا ۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ۔ جاوید اب بالکل تندرست ہے ۔ آج پورے ایک سال کا ہو گیا ہے ۔ اس کی والدہ آج قربانی دینے میں مصروف ہے ۔ آپ اور والدِ مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے ۔ حضرت بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے ۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے ۔ والدِ مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا ، وہ بحیثیتِ مجموعی درست ہے ۔ ان کا اصلی گاؤں لوچر نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ ادون تھا ۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے ۔ بیوی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے ، اس واسطے ترکِ دنیا کرکے کشمیر سے نکل گئے ۔

واپس آنے پر اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین[1] کے مرید ہوئے ، جو حضرت نور الدین ولیؒ کے مرید تھے ۔ بقیہ عمر انھوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار[2] میں مدفون ہیں ۔ اب

۱۔ بابا نصر الدین اور ان کے مرشد حضرت نور الدین ولی ریشی کے حالات کے لیے صحیفہ اقبال نمبر ، ۱۹۷۳ع ، جلد اول ، ص : ۱ - ۱۲ پر ڈاکٹر محمد باقر کا مضمون ''اقبال کے اجداد کا سلسلۂ عالیہ'' ملاحظہ فرمائیے ۔

۲۔ چرار شریف جو سری نگر کے جنوب مغرب میں بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔

آمید ہے کہ مزید حالات معلوم ہو جائیں گے ۔ خواجہ اعظم کا تذکرہ مختصر ہے مگر یہ مختصر نشان غالباً مزید انکشافات کا باعث ہوگا ۔ ان حالات کے معلوم ہونے کا سبب بھی عجیب و غریب ہے ۔ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار[۱] ، الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل

۱۔ دہلی یونیورسٹی اُن دنوں نئی نئی قائم ہوئی تھی ۔ غلام محی الدین صوفی اس کے سب سے پہلے رجسٹرار تھے جنھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ (Islamic Culture in Kashmir) لکھ کر الہ آباد یونیورسٹی میں پیش کیا تھا ۔ ممتحنوں میں دو یورپ کے مستشرق تھے اور تیسرے علامہ اقبال ۔ مگر وہ مقالہ کسی وجہ سے ڈاکٹریٹ کے قابل نہ سمجھا گیا ۔ چنانچہ انھوں نے کسی اور موضوع پر دوسرا مقالہ لکھ کر ۱۹۳۵ع میں ساربون (پیرس) یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی ۔ اس کے چند سال بعد انھوں نے اپنے پہلے مقالے کو بھی ترمیم و اضافہ کے ساتھ ''کشیر'' کے نام سے پنجاب یونیورسٹی کے کسی فنڈ کی مدد سے دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا ۔ اس میں راقم الحروف کے مشورے بھی شامل ہیں جس کا اعتراف کتاب میں کیا گیا ہے ۔ راقم کے پاس ''اسلامک کلچر ان کشمیر'' کی ایک ابتدائی نجی کاپی بھی موجود ہے جس پر ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کے دستخط ثبت ہیں ۔

ڈاکٹر صوفی کے والد علی الدین خاں کشمیر سے آ کر امرتسر میں آباد ہوئے اور شال پشمینے کی تجارت میں نام پیدا کیا ۔ صوفی صاحب ۳۰ جون ۱۸۸۶ع کو وہیں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے انگریزی اخباروں میں اور پھر محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کی ۔ وہ معمولی معلم سے ترقی کرکے ۱۹۲۲ع سے ۱۹۲۶ع تک دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے اور ہر شعبے کو ترقی دی ۔ آخر ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ۳۲ سال کی نمایاں خدمات کے بعد ۱۹۴۰ع میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور کراچی میں ۱۸ اپریل ۱۹۶۲ع

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کرنے کے لیے ایک کتاب کشمیری تہذیب و تمدن پر لکھ رہے ہیں۔ میں ان کے ممتحنین میں سے ہوں۔ باقی دو ممتحن انگلستان اور آئرلینڈ کے پروفیسر ہیں۔ اتفاق سے رجسٹرار صاحب کل آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کسی اپنے دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر کا قلمی نسخہ میرے مکان پر پہنچا دے۔ وہ شخص قلمی نسخہ تاریخِ مذکور کا لایا۔ میں اس وقت فارغ بیٹھا تھا، یہی کتاب دیکھنی شروع کردی۔ دوچار ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا، جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ غالباً بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہوگی۔ ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں

(بقیہ حاشیہ صحفۂ گزشتہ)

کو انتقال فرمایا۔ سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ دنیا کے اکثر ملکوں کے دانش وروں سے مل کر تعلیمی اور تاریخی معلومات حاصل کیں۔ کشمیر، المنہاج، ثمرہ اور صغریٰ وغیرہ تین چار کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

۱۹۲۳ء میں جب علامہ اقبال 'سر' کے خطاب سے سرفراز ہو کر وائسرائے ہند کے دربار میں شرکت کے لیے دہلی گئے تو ڈاکٹر صوفی نے آپ کے اعزاز میں ایک پرلطف ضیافت کا اہتمام کیا جس میں مرزا اعجاز حسین ایڈووکیٹ، نواب سر ذوالفقار علی خاں، سردار امراؤ سنگھ، خواجہ سجاد حسین فرزند مولانا حالی، مولوی بشیر الدین ابن مولوی نذیر احمد اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے علاوہ چند انگریز پروفیسر اور متعدد رؤسا اور اہل قلم بھی شریک تھے۔ (تاریخ اقوام کشمیر، جلد ۲، صفحات ۱۹۱ - ۱۹۲)۔

کا سارا سلسلہ موجود ہو - والسلام

باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ، والدِ مکرم کی
خدمت میں آداب عرض کریں   محمد اقبال"

بابا لول حج ہی کے سلسلے میں شیخ محمد اکبر ایک باعمل صوفی تھے ، جن کے تقدس کا بڑا شہرہ تھا - انھوں نے کئی دفعہ پنجاب کا سفر بھی کیا - مرشد نے ان کی شرافت و نجابت کی بنا پر ان کی شادی اپنی صاحبزادی سے کر دی تھی - چنانچہ شیخ کی وفات کے بعد وہی ان کے جانشین مقرر ہوئے - ان کی چوتھی پشت میں چار بھائی شیخ محمد رمضان ، محمد رفیق ، عبداللہ اور عبدالرحمٰن افغانوں کے عہد میں کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں مقیم ہوئے - ان کے والد شیخ جمال الدین چونکہ کشمیر ہی میں رہے ، اس لیے سیالکوٹ میں کسی کو ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا :

(۱) شیخ محمد رمضان سب سے بڑے تھے - انھوں نے تصوف پر فارسی زبان میں چند کتابیں لکھ کر اپنی صوفی مشربی کا ثبوت دیا - ان کی تین لڑکیوں کے سوا کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ، اس لیے سلسلہ آگے نہ چل سکا -

(۲) دوسرے بھائی شیخ محمد رفیق نے سیالکوٹ میں بزازی کی دکان کھولی اور ان کے فرزندِ اول شیخ نور محمد نے بھی اپنے والد کی دکان پر ہی کام کیا - شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال انھی کے فرزند تھے -

شیخ محمد رفیق کے فرزند دوم شیخ غلام محمد محکمۂ نہر میں ملازم ہوکر روپڑ میں مقیم تھے کہ شیخ محمد رفیق بیٹے سے ملنے روپڑ گئے - وہیں ہیضے سے بیمار ہوئے اور انتقال کر

گئے - ان کی آخری آرام گاہ روپڑ ہی میں ہے -

(۳) تیسرے بھائی شیخ عبداللہ نے ضلع سیالکوٹ کے موضع جیٹھے کی میں بود و باش اختیار کی - ان کی اولاد میں سے اکثر ریاست حیدر آباد دکن میں چلے گئے اور وہیں زراعت میں مشغول ہوگئے -

(۴) سب سے چھوٹے بھائی شیخ عبدالرحمٰن نے بھی سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی - ان کی اولاد وہیں آباد ہے -

اقبال کے والدِ بزرگوار شیخ نور محمد کی کُنیت ناک چھدنے کی وجہ سے شیخ نتّھو تھی - وہ بڑے وجیہ، اچھے قد آور، خوش پوش اور خوش مذاق انسان تھے - اپنے شوق سے لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے - تجارت پیشہ ہونے کے باوصف صوفیا اور علما کی مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے سے شریعت و طریقت کے رموز و نکات خوب سمجھتے تھے اور علم مجلسی سے اچھی طرح واقف تھے - ان پر تصوف اور روحانیت کی گہری چھاپ تھی - یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مل کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا - اقبال اپنے والد کے روحانی مدارج کے کئی دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے - کہتے تھے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کو دین و دنیا کی ترقی کا باعث خیال کرتے تھے اور اقبال کو بھی یہی تلقین کیا کرتے تھے کہ بیٹا ! قرآن اس طرح پڑھا کرو گویا وہ تمھیں پر نازل ہوا ہے یا خدا تم سے ہم کلام ہے[۱] - اقبال نے اس خیال کو یوں محفوظ کیا ہے :

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف

۱- الایمان، امرتسر، دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۸۲ - جوہر اقبال، ص ۱-۲ -

شیخ نور محمد اسّی برس کے سن میں بصارت کھو چکے تھے۔ غالباً ۹۳ برس کی عمر پا کر ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ اقبال نے یہ قطعۂ تاریخ لکھا جو امام صاحب کے قبرستان میں مرحوم کے سنگِ مزار پر کندہ ہے[1] :

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہ رواں ، منزلِ ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز ''اثر رحمت'' و ''آغوش لحد''

۱۳۴۹ھ　　　۱۳۴۹ھ

اس سے پندرہ سولہ سال قبل ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو جب اقبال کی والدہ محترمہ (امام بی) فوت ہوئی تھیں تو حضرت اکبر الہ آبادی نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے جو اشعار کہے تھے ، ان میں والدین کی تربیت کے اثرات پر خاص طور سے اشارہ ملتا ہے[2] :

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ خود آگاہی ، یہ خوش گوئی ، یہ ذوق معرفت
یہ طریقِ دوستی ، خود داریٔ باتمکنت
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے ، اہلِ دل تھے ، صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انھی کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت

۱- باقیات اقبال ، ص ۴۹۳ -
۲- کلیات اکبر ، جلد دوم ، سوم ، بزم اکبر کراچی ، ص ۴۲۱ -

روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
مادرِ مرحومۂ اقبال جنّت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے ، قلب ہے اندوہ گیں
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے
سال رحلت کا یہاں منظور اسے فی‌الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات
"رحلتِ مخدومہ" سے پیدا ہے تاریخِ وفات

۳۳۳ھ

حضرت اکبر ہی کا یہ قطعۂ تاریخِ وفات ، مرحومہ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے :

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت
سوئے جنّت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُردرد و غم
"رحلتِ مخدومہ" تاریخِ وفات

۱۳۳۳ھ

اقبال کو بزرگانِ دین ، اولیائے کرام اور اہل اللہ سے خاص عقیدت تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ تمام ایسے اوصاف و محاسن ، جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں ، محض انھی بزرگوں کی تعلیم و تربیت اور فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں ۔ وہ اولیا کی کرامتوں کے بھی قائل تھے اور پیر یا مرشد کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس کے بغیر انسان کوئی صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتا ۔ کہتے تھے کہ "روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف اُن ہی لوگوں کو ہوگا جو اہلِ دل ہیں ، جن کے دل میں درد ہے ،

جن کے قلب میں گرمی اور جن کی روح میں تڑپ ہے ۔ لیکن کم سے کم اخلاق فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے ۔ پیر کی صحبت سے (بشرطیکہ پیر دوکان داری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے اور جس کا اخلاق درست ہے ، جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے اعمال ، اعمالِ حسنہ کہے جاتے ہیں ، اس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہو سکتا ہے ۔''[1]

اقبال کے والد شیخ نور محمد اور خود اقبال نے بھی قادری سلسلے کے ایک بزرگ قاضی سلطان محمود[2] کے دست حق پرست پر بیعت کی ہوئی تھی حالانکہ وہ اکثر گدی نشینوں کے طرز عمل سے خوش نہیں تھے ۔ چنانچہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ع کے ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

''خواجہ نقش بند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے ۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں مَیں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر گیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو

۱۔ رسالہ طریقت لاہور ، اگست ۱۹۱۴ع ۔

۲۔ قاضی سلطان محمود صاحب ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ع) میں آوان شریف ضلع گجرات کے ایک کھوکھر گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ باپ کا نام غلام غوث تھا جو صاحبِ شریعت و طریقت بزرگ تھے ۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد مختلف بزرگوں سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا اور ۲ مئی ۱۹۱۹ع کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔ (مقامات محمود ، از نواب معشوق یار جنگ ، و مضمون محمد الدین فوق ، مطبوعہ رسالہ صوفی ، جنوری ۱۹۱۹ع ، ص ۸ ۔

عجمیت سے پاک کرنا تھا ۔"[1]

۱۹۲۱ع میں اقبال نے تاج الاولیا بابا تاج الدین ناگپوری کی شہرت سنی تو ان کی زیارت کے لیے بے تاب ہوکر ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۱ع کے ایک خط میں مہاراجہ سر کشن پرشاد مدارالمہام حیدر آباد دکن کو لکھا:

"ناگپور میں ایک بزرگ مولانا تاج الدین نام ہیں ۔ کیا سرکار نے کبھی ان کا نام سنا یا ان کی زیارت کی ؟ حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی سے ان کی بڑی تعریف سنی ہے اور لاہور کے ایک اور دوست بھی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد ہے ۔ دیکھیے کب لاہور کی زنجیروں سے خلاصی ملتی ہے ۔ چشتی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ چوبیس گھنٹے میں بیشتر حصہ مجذوبانہ حالت میں رہتے ہیں مگر سنا ہے کہ رات کے دو بجے کے بعد سے صبح تک ان کے فیضان کا دروازہ کھل جاتا ہے ۔ حیدر آباد میں کوئی مولوی یا منشی محمد اسمٰعیل صاحب ان کے پیر بھائی ہیں ۔ شاید سرکار کو معلوم ہو ۔ غرض جن جن ذرائع سے معلوم ہوا آدمی قابلِ زیارت ہیں ۔"[2]

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ع کو پھر لکھا کہ "میرا قصد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے ۔ بعض وجوہ سے تجدیدِ بیعت کی ضرورت پیش آئی ہے ۔ سنتا ہوں کہ وہ مجذوب ہیں مگر آج کل زمانہ

۱۔ شیخ عطاء اللہ : اقبالنامہ ، حصہ اول ، ص ۷۹ ۔

۲۔ سہ ماہی صحیفہ ، اقبال نمبر ، اکتوبر ۱۹۷۳ ، ص ۱۸۲ ۔

بھی مجاذیب کا ہے - بہرحال اگر مقدر میں ہے تو انشاء اللہ ان سے مشکل کا حل ہوگا - آج خواجہ حسن نظامی صاحب کو بھی خط لکھا ہے - اگر وہ بھی ہم سفر ہوگئے تو مزید لطف رہے گا -''[۱]

۱۹۰۴ع میں اقبال کے دوست منشی محمد الدین فوق نے لاہور کے ہندو مسلمان صوفیوں اور بزرگوں کا تذکرہ ''یادِ رفتگاں'' کے نام سے شائع کیا تھا - اقبال نے یہ کتاب دیکھی تو فوق صاحب کو لکھا :

''اہل اللہ کے حالات نے ، جو آپ نے بنام ''یادِ رفتگاں'' تحریر فرمائے ہیں ، مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض بعض باتوں نے ، جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں ، مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہوگیا - خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے - زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے - میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حسن ظن کا دور ہو جانا ہے - بھائی فوق ! خود بھی اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے -'' (۷ اکتوبر ۱۹۰۴ع)

اسی کتاب سے متاثر ہو کر اقبال نے وہ غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں[۲] :

۱- صحیفہ ، اقبال نمبر ، حصہ اول ، اکتوبر ۱۹۷۳ع ، ص ۱۸۵ -
۲- بانگِ درا -

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی ! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھی خلوت گزینوں میں

اقبال اپنے فرزند جاوید سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے خاندانی عارفانہ مذاق کو زندہ رکھتے ہوئے اس فقر کی تلاش میں رہے جس کی جڑیں اسلام میں پیوست ہیں اور جس سے آدمی میں اللہ کی شانِ بے نیازی پیدا ہوتی ہے۔ اس تلقین و ارشاد کے چند جرعے آپ بھی چکھ لیں۔ جاوید سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں :

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ
ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربار شہنشہی سے خوش تر
مردانِ خدا کا آستانہ
لیکن یہ دور ساحری ہے
انداز ہیں سب کے جادوانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک
باقی ہے کہاں مئے شبانہ

خالی ان سے ہوا دبستاں
تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخ گل پر چہک و لیکن
کر اپنی خودی میں آشیانہ

(۲)

سینے میں اگر نہ ہو دل گرم
رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں
شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی
ہے میری بساط کیا جہاں میں ؟
بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدق مقال ہے کہ جس سے
میں چشم جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے ، جسے دے
میراث نہیں بلند نامی

(۳)

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

(ضربِ کلیم)

ڈاکٹر جاوید اقبال کا خیال ہے کہ ''ان (علامہ اقبال) کے تجربے میں تو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسی نعمت ہے جس کے ذریعے وہ اپنے تمام فکری مسائل حل کر سکے تھے۔ اس لیے قرآنی تعلیمات سے ان کا شغف، اسلام کے ساتھ ان کی محبت اور مسلمان ہونے پر ان کا فخر وہ فطری عناصر تھے جنھوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل کی۔''[1]

• • •

۱۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال : ''زندہ رود'' طبع ۱۹۷۸ع، ص ۱۶۔

لاہور کے مشاعرے

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد دلی کے آسمانِ ادب سے چند ٹوٹے ہوئے ستارے گردش روزگار کے ہاتھوں لاہور پہنچے - ان میں مولانا الطاف حسین حالی ، مولانا محمد حسین آزاد ، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور شہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - ان لوگوں نے دلی مرحوم کی یاد میں یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں جمائیں اور اس طرح سرزمین پنجاب کے لوگ ان ادبی روایات اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئے جو اس سے پیشتر دلی سے نکل کر اودھ ، مرشد آباد ، عظیم آباد اور حیدر آباد میں اپنا گھر بنا چکی تھیں - یوں کہنا چاہیے کہ پنجاب میں پہلی نسل کے لوگوں نے حالی ، آزاد ، فیض اور ارشد وغیرہ کو اُردو بولتے ہوئے سنا اور دوسری پشت میں ہمارے ہاں جو لوگ پیدا ہوئے ان میں شیخ عبدالقادر ، علامہ اقبال ، مولانا ظفر علی خاں ، چودھری خوشی محمد ناظر ، میر غلام بھیک نیرنگ ، میاں محمد شاہ دین ہمایوں ، مولوی انشاء اللہ خاں ، مولوی محبوب عالم ، خان احمد حسین خاں ، مولوی محرم علی چشتی ، پنڈت شیو نرائن شمیم اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ کا نام سرفہرست ہے - یہ بزرگ اُس وقت بھی کمالِ فن کے اعتبار سے خداوندانِ سخن تھے اور آج بھی اس میدان میں ان کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا -

اقبال کی شاعری ، جو سیالکوٹ میں شروع ہو چکی تھی ، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوتے ہی منظر عام پر آئی اور وہ عام

مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن دینے لگے ۔ طبیعت زوروں پر تھی ۔ آپ نے چند روز مرزا ارشد گورگانی سے مشورہ لیا ۔ پھر خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک نواب میرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کرکے ان سے اصلاح لینی شروع کی ، جس کے بعد آپ کا کلام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ۔ خیالات میں چونکہ جدت اور اپج تھی ، اس لیے آپ کے اشعار اکثر پسند کیے جاتے تھے ۔ آپ نے زمانے کے مذاق اور وقت کے تقاضوں کے مطابق انگریزی نظموں کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی جسے بہت سراہا گیا ۔

اس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی ابتدائی حالت میں تھی ۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری ، مرزا ارشد گورگانی دہلوی ، میر ناظر حسین ناظم لکھنوی ، منشی الٰہی بخش رفیق اور ان کے شاگردوں کے دم قدم سے پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں شاعری کا کچھ کچھ چرچا ہو چلا تھا ۔ مگر

گیسوئے اردو ابھی منّت پذیر شانہ تھی

ان بزرگوں سے کچھ پہلے مولوی محمد حسین آزاد دہلوی اور خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی اردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوشش کر چکے تھے ۔ انھوں نے کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیماتِ پنجاب کے ایماء سے ۱۸۷۴ع میں ایک جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی ، جس میں مصرع طرح کی بجائے کسی مضمون کا عنوان دیا جاتا اور مشاعرے میں شعرا اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس پر طبع آزمائی کرکے لاتے ۔ یہ مشاعرے ''انجمن پنجاب'' کے دفتر میں بڑی شان سے ہوتے تھے ۔ دراصل اس زمانے کا لاہور آج کل کے لاہور جیسا نہیں تھا ، جہاں علم کے دریا بہہ رہے ہیں اور زمانے بھر کے اہلِ کمال ، ادیب اور شاعر سمٹ کر اس میں جمع ہو گئے

ہیں۔ وہ لاہور ایسا تھا کہ مولانا حالی جیسے سنجیدہ، متین، خاموش اور بے لفس انسان کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

رہے لاہور میں آ کر، سو جانے
یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

اور اسی بنا پر حالی نے ۱۸۷۵ع کے شروع میں اپنا تبادلہ اینگلو عربک سکول دہلی میں کرا لیا تھا۔ ان کے لاہور سے چلے جانے کے بعد مشاعروں کا سلسلہ تو بند ہو گیا البتہ مولانا آزاد برابر اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کی توجہ اور آبیاری سے پنجاب میں اردو کا باغ آہستہ آہستہ پھل پھول لاتا رہا۔ مولانا حالی اور آزاد کا نام تو سر رشتہ تعلیمات پنجاب کی نصابی کتب کے ذریعے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا مگر دوسرے بزرگوں کو زود فراموش زمانے نے فراموش کردیا حالانکہ ان کے کارنامے بھی اسی طرح یاد رکھنے کے قابل ہیں جس طرح مولانا آزاد وغیرہ کے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری:

آپ ہماری اس قدیم علمی بزم کی آخری شمع تھے، جو صدیوں تک تہذیبِ اخلاق اور تنویرِ فکر و ذہن کا سرچشمہ رہتی ہے۔ سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۶ع) میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام خلیفہ علی بخش تھا۔ بچپن کھیل کود میں گزرا۔ عنفوانِ شباب میں پہلوانی کا شوق ہوا اور اکھاڑوں میں جا کر ورزش کرنے لگے۔ پندرہ سال کی عمر تک اس دھندے کے سوا دوسرا کوئی ہنر ہی نہ سیکھا۔ جب طبیعت اس طرف سے اکتا گئی

تو تحصیلِ علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ باپ نے فارسی گویا گھول کر پلا دی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھا دیں۔

دہلی میں تکمیلِ علوم کی۔ کچھ عرصہ مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور سے فیض حاصل کیا۔ شیفتہ، صہبائی، مومن، ذوق اور غالب کی صحبتوں سے بھی مستفید ہوئے۔ رام پور اور لکھنؤ میں بھی کچھ عرصہ گزارا۔ راگ رنگ کی محفلوں کا ہمیشہ ہی شوق رہا۔ آپ کی فارسی مثنوی 'چشمۂ فیض' کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

بنام آں کہ رقصِ بسملِ او   زمیں گرداند از پہلو بہ پہلو

سہارنپور کی مشہور گانے والی طوائف عیدن بائی کے نام پر آپ نے ایک اردو مثنوی "صبحِ عید" لکھی جو تقریباً بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ عیدن بائی کی تعریف میں کہتے ہیں:

حسن کیا صاف فتنۂ آفاق
ناز کیا محض غارتِ عشاق
پورے سانچوں ڈھلے ہوئے اعضا
سچّے کانٹوں تلا ہوا نقشا
حسن ذاتی تھا ذات میں اس کی
بات تھی بات بات میں اس کی
ان کمالوں پہ خوب گاتی تھی
گانے والوں میں نام پاتی تھی
ایک توڑا لگا دیا اس نے
تا کفِ پا جلا دیا اس نے
صبر تاراج اضطراب ہوا
الغرض کام سب خراب ہوا

دل کی مجبوری کے باوجود دامن کسی فسق و فجور سے آلودہ نہیں کیا - ابتدائے ہوش سے پابندِ صوم و صلواۃ تھے - حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی - نازک مزاجی کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ان کی والدہ بیمار ہوئیں تو آپ ایک طبیب کو رات کے وقت بلانے گئے - انھوں نے آنے میں عذر کیا - اس وقت تو خون کے گھونٹ پی کر چلے آئے - پھر خود طب سیکھ کر دم لیا - آخر جملہ علوم ادب ، فقہ ، اصول فقہ ، حدیث اور طب میں ماہر مانے گئے -

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں دہلی سے بچ کر سہارنپور آ گئے - پہلے طب کی آمدنی سے بسر اوقات کی - پھر اوریئنٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہو گئے - جب اوریئنٹل کالج سے عربی کا رسالہ شفاء الصدور نکلنے لگا تو اس کی ادارت بھی آپ ہی کے سپرد ہوئی - مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے حماسہ ان سے یہیں لاہور میں آ کر پڑھا تھا - مولانا نے سترہ سال اوریئنٹل کالج کے طلبا کو فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا -

مولانا بڑے زندہ دل ، خوش مزاج اور ظریف الطبع تھے - نہایت سادہ لباس پہنتے تھے - اپنی لیاقت اور واقفیتِ علوم خواہ مخواہ کسی پر نہ جتاتے تھے - انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے مگر مولانا محمد حسین آزاد سے اکثر نوک جھونک رہتی تھی - میر محفوظ علی بدایونی کا بیان ہے کہ جن دنوں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا فیض الحسن اوریئنٹل کالج لاہور میں برسر خدمت تھے ، دونوں میں کچھ شکر رنجی ہو گئی تھی - جب مولانا فیض الحسن ، مولانا آزاد کے کمرے کی طرف سے گزرتے تو ادھر منہ کرکے کھنکار کر تھوک دیتے - جب دو ایک مرتبہ یہ حرکت ہوئی اور آزاد سمجھ

گئے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ ارادی ہے ، تو ایک مرتبہ جب مولوی فیض الحسن ادھر سے گزرنے لگے ، آزاد اپنے کمرے کے دروازے پر آ کر منہ بنا کر کہنے لگے :

''ارے ! میں تو تھوکتا بھی نہیں''[1]

مولانا کی تصنیفات میں مشہور یہ ہیں : (۱) حلِ ابیاتِ بیضاوی (عربی) ، (۲) تعلیقات الجلالین (عربی) ، (۳) فیضی (شرح حماسہ — عربی) ، (۴) تحفۂ صدیقیہ (اُم زرع کی مشہور حدیث کی شرح عربی زبان میں) ، (۵) دیوانِ حسّان بن ثابت مع مقدمہ و حواشی ، (۶) ریاض الفیض (شرح السبع المعلقات — عربی ، فارسی ، اردو) ، (۷) حاشیہ دیوان النابغۃ الذبیانی ، (۸) فیض القاموس ، (۹) عروض المفتاح ، (۱۰) دیوان الفیض (عربی) ، (۱۱) شرح تاریخ تیموری (عربی) ، (۱۲) ضوء المشکٰوۃ (حدیث کی مشہور کتاب مشکٰوۃ المصابیح کی شرح عربی میں) ، (۱۳) خلاصۂ کتاب ایلاقی (عربی) ، (۱۴) قرابادین فیضی (فارسی) ، (۱۵) نسیم فیض (دیوان فارسی) ، (۱۶) مثنوی روضۂ فیض (فارسی) ، (۱۷) مثنوی چشمۂ فیض (فارسی) ، (۱۸) فیضیہ (فنِ مناظرہ پر چھوٹا سا رسالہ اردو میں) ، (۱۹) گلزارِ فیض (دیوانِ اردو) ، (۲۰) مثنوی صبحِ عید (اردو)۔

اکثر کتابیں چھپ چکی ہیں اور مل جاتی ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند کے عربی ادب میں تو مولانا نے انقلاب عظیم پیدا کیا ۔ آپ کے فارسی کلام کا بھی وہی رنگ ہے جو ایک ایرانی خوش گو کا ہوتا ہے ۔ وہی بندش کی چستی ، خیالات کی رنگینی ، تراکیب کا تنوع ، فقروں کا در و بست اور الفاظ کا ترنم ہر جگہ موجود ہے ۔ ایک

۱۔ مرزا عسکری لکھنوی : نوادر ، مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ ، ص ۱۱۲ ۔

خصوصیت یہ ہے کہ مرحوم ایسے خیالات ادا کرتے تھے جو واقعی ان کے دل میں موجزن ہوتے تھے ۔ ان کا ہر شعر ان کے جوہرِ کمال کا آئینہ دار ہوتا تھا ۔ حکیم احمد شجاع نے اقبال کو بھی اکثر ان کے شعر پڑھتے اور تعریف کرتے سنا ہے ۔[1]

اس مسئلے کو ، جسے غالب پیچیدہ بندشوں سے اس طرح ادا کرتا ہے :

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مولانا کا قلم اس طرح پامال کرتا ہے :

زاہد برآں مناز کہ دنیا گزاشتم
ایں ہمتِ من است کہ عقبیٰ گزاشتم

اقبال نے شاید اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے :

زاہد کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

غرض لاہور ہی میں مولانا فیض الحسن کی علمیت اور فضیلت کے حقیقی جوہر کھلے اور یہ چشمۂ فیض دریائے فیض بن گیا ۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :

تھی فیض کو جو پھولنے پھلنے کی آرزو
یاں تک گل اس نے کھائے کہ پھولوں سے پھل گیا

اس جوئے رواں کی فیض رسانی کا سلسلہ ان کے شاگردوں کی بدولت اب تک جاری ہے ۔

۱۔ لاہور کا چیلسی ، نقوش لاہور ، شمارہ ۱۰۲ ، جنوری ۱۹۶۶ء ، ص ۲۳ ۔

مرزا ارشد گورگانی :

دوسرے بزرگ ، جن کے دم سے یہاں اردو ہر دلعزیز ہوئی ، شہزادہ مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی خلف مرزا علی بہادر تھے ، جو دہلی کے شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے - اردو زبان ان کی کنیز خانہ زاد تھی - وہ دہلی کے قلعہ معلی میں پیدا ہوئے مگر ابھی سات آٹھ ہی برس کے تھے کہ ہنگامہ غدر نے خاندان شاہی کے ساتھ ان کو بھی اپنے آبائی محل سے نکال کر پراگندہ کردیا - طفولیت کے ایام قطب صاحب میں گزرے - وہیں درسی کتابیں ختم کیں - جب انقلاب زمانہ سے دہلی اجڑ گئی اور انھیں معاش کی فکر لاحق ہوئی ، تو سر رشتہ تعلیم پنجاب میں منسلک ہو کر کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا - پھر فیروز پور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں فارسی کے معلم ہوگئے اور اقلیم سخن پر حکمرانی کرنے لگے - شاعری کی ابتدا بچپن سے ہوئی - مرزا قادر بخش صابر مرحوم رشتے میں آپ کے ماموں ہوتے تھے - انھوں نے عروض و قافیہ پڑھایا اور شعر کہنے کا شوق دلایا - بہت کچھ کہا مگر مزاج کی بے پروائی کی وجہ سے تدوین کلام کی نوبت نہیں آئی - چنانچہ آپ کے خاندان کی طرح کلام بھی پریشان ہی رہا -

مرزا صاحب فیروز پور سے اکثر لاہور تشریف لاتے تھے - طبیعت دوست پرور تھی - جو کوئی بلاتا ، مروت سے چلے آتے - مشاعرہ ہے تو اس میں موجود ، مجلس عزا ہے تو وہاں مرثیہ پڑھ رہے ہیں - انجمنوں کے سالانہ اجلاس ہیں تو ان کی رونق بڑھا رہے ہیں - اتنی جگہوں سے انھیں بلاوے آتے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا ہر جگہ پہنچنے کے لیے وقت کہاں سے نکالتے تھے اور سب کے لیے نظم کب لکھتے تھے - طبیعت میں آمد بلا کی تھی - مضامین گویا صف بستہ

حاضر رہتے تھے - قوافی پر عبورِ کامل تھا - بات کرتے کرتے مصرعے اور شعر موزوں ہو جاتے تھے - کبھی ریل میں آتے آتے سفر میں جلسے کے لیے نظم لکھ رہے ہیں - کبھی بے نظم چلے آ رہے ہیں اور جلسے میں اپنی نوبت آنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے الگ جا بیٹھے ہیں اور ایک نظم لکھ لائے ہیں -

ان کا کلام عموماً شگفتہ ، عام فہم اور سادہ تھا - اگر اس میں کوئی عیب تھا تو وہ پُر گوئی اور جلد بازی کا نتیجہ تھا - تاہم غزل کے میدان میں وہ صفِ اول کے شعرا میں جگہ پانے کے مستحق تھے - وہ نہایت خوش خلق اور خوش خو تھے لیکن جب کسی سے ناراض ہو جاتے تو ان کا غصہ بھی ایسا تھا کہ الامان ! دوسرے شعرا کو حریف و رقیب سمجھنے میں متقدمین کا نمونہ تھے - کسی کی تعریف ان کے سامنے کرنا انھیں اکثر برہم کر دیتا تھا - شاعری میں ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا - ابتدا میں چند روز اقبال بھی ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے - انھی دنوں اقبال کا یہ شعر سن کر مرزا صاحب نے پیشین گوئی کی تھی کہ اقبال عظیم شاعر بنے گا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا صاحب کی تصانیف میں شہنشاہ نامہ یعنی سوانح عمری ملکہ وکٹوریہ ، عشرۂ کاملہ ، تضمین ارشد ، نالۂ یتیم ، مرقع حکمت ، جوہر تیغ ، تحفہ وغیرہ چھپ چکی ہیں - منشات ارشد ، مرقع عبرت ، دیوان اُردو اور مجموعۂ نظم و نثر کے مسودے یونھی پڑے پڑے تباہ ہو گئے -

آخری عمر میں سال بھر سے زیادہ علیل رہ کر علاج کے لیے

دہلی گئے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد پھر فیروز پور میں واپس آ گئے ۔ آخر اپنے بڑے بیٹے مرزا بلند اختر رشید کے پاس ملتان چلے گئے جو وہاں ریل کے دفتر میں نقشہ نویس تھے ۔ وہیں ۵۸ برس کی عمر پا کر ۲۱ فروری ۱۹۰۶ع کو انتقال کیا ۔ وفات سے چند منٹ پیشتر یہ شعر کہا :

از کشا کشِ ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

صاحبِ عالم مرزا مجاہد الدین بہادر شاہی نے یہ تاریخ وفات کہی :

کہہ دو شاہی میرزا ارشد سوئے جنت گئے

کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :

ہنس کے فرمانے لگے سن سن کے وہ نالے مرے
آپ کب سے ہو گئے ہیں چاہنے والے مرے
قبر میں کوئی خبر لینے نہ آیا بعدِ مرگ
زندگی تک تو بہت تھے چاہنے والے مرے
ضبط الفت کی قسم کھاتا ہوں لیکن کیا کروں
جان کھا جاتے ہیں ارشد پوچھنے والے مرے

اے شوخ یہ دکھنے جو تری آ گئیں آنکھیں
کیا دل کے دُکھانے کا مزا پا گئیں آنکھیں
یہ کہہ گئیں چھٹنے کی نہیں رسمِ محبت
سمجھے نہیں تم خود بھی جو فرما گئیں آنکھیں
کیوں باغ میں نرگس کے تلے مر گئے ارشد
معلوم نہیں کس کی پسند آ گئیں آنکھیں

اضطرابِ بے خودی شب کس کے گھر پر لے چلا
میں چلا رہبر کو لے کر، مجھ کو رہبر لے چلا
مے پرستو! دیکھنا میرا دلِ نازک نہ ہو
آج زاہد توڑنے کو جام، پتھر لے چلا
دل لگی کا ہو برا کیا کیا اٹھائیں ذلتیں
غیر کے گھر ساتھ مجھ کو وہ ستم گر لے چلا

میر ناظر حسین ناظم لکھنوی :

میر صاحب سادات باہرہ (بارہہ) کے مشہور بادشاہ گر خاندان کی یادگار تھے۔ ان کے والد سید ولایت حسین صاحب دیوان سید محمد علی ابن سید عبدالوہاب کی نسل سے تھے۔ قصبہ ککرولی (ضلع مظفر نگر) کے محلہ درگاہ کے رہنے والے تھے مگر چونکہ لکھنو کے دبستان سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے لکھنوی کہلاتے تھے۔ آپ کا نام تاریخی تھا جس سے سنہ ولادت ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ع) نکلتا ہے۔[1] اپنے وطن کے عام معیار کے مطابق فارسی، عربی، فلسفہ، منطق اور ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

ناظم بڑے وجیہ، خوش وضع، خوش گو اور خوش باش شاعر تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، شگفتہ مزاجی اور حاضر جوابی کے لطیفے آج تک کئی بزرگوں کے حافظے میں محفوظ ہیں اور وہ اپنی محفلوں میں انھیں بیان کر کرکے مزے لیتے ہیں۔ وہ مذہب امامیہ رکھتے تھے اور مرثیہ گوئی میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ اس فن میں انھیں لکھنو کے مشہور باکمالوں بالخصوص میر انیس کے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس مرحوم سے شرفِ تلمذ

۱۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین : بزم ناظم، طبع ۱۹۷۵ع، ص ۵۔

حاصل تھا ، جو پچاسی برس کی عمر پا کر ۱۹۰۱ع میں فوت ہوئے۔ ناظم صحیح معنوں میں اپنے استاد کے جانشین تھے۔

میر ناظر حسین ناظم نے بیس بائیس سال کے سن میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ۱۸۸۵ع میں لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار "ناظم الہند" جاری کیا اور بقیہ زندگی یہیں گزار دی۔ لاہور ہی میں عقد ثانی بھی کیا جس سے ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے سید شاہجہان حسین اور سید مقصود حسین پیدا ہوئے۔ میر صاحب نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۷ع (۱۱ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ) کو ایک وبا کے دوران لاہور میں انتقال کیا اور مومن پورہ قبرستان میں دفن ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کی بیٹی نے قضا کی اور ان کے چہلم کے روز ان کی سیدانی بیوی کی روح بھی ان سے جا ملی[1]۔

ناظم نثر و نظم دونوں پر یکساں حاوی تھے۔ مرثیہ گوئی سے خاص مناسبت کے باوجود اپنے مخصوص قدیم رنگ میں غزل بھی کہتے تھے مگر ان کی غزلوں پر مرثیہ کا رنگ غالب رہتا تھا۔ ان کے ایک ہی شعر سے ان کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہو جاتا ہے:

اک جہاں کشتۂ انداز خود آرائی ہے
آپ جو چاہیں کریں آپ کی بن آئی ہے

پھر بھی عام مشاعروں میں مرزا ارشد گورگانی کے سامنے ان کا چراغ نہ جلتا تھا۔ آخری عمر میں انھوں نے غزل کہنی بالکل چھوڑ دی تھی اور صرف مرثیے کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ شہدائے کربلا کے دردناک حالات پر دل گداز مرثیے لکھتے اور لاہور کی مجالس میں پڑھ کر سناتے تھے۔ اس صیغے میں وہ اپنے دوست مرزا

۱- بزم ناظم ، ص ۵ -

ارشد گورگانی سے بازی لے گئے تھے۔

شاعری میں ان کے بھی بہت سے شاگرد تھے جن کی مرزا ارشد گورگانی کے شاگردوں سے اکثر چشمک رہتی تھی۔ اقبال نے اسی بنا پر کہا تھا:

اقبال لکھنؤ سے، نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

آپ نے غزلوں کا ایک دیوان ترتیب دیا اور ''ساغرِ خوں'' تاریخی نام رکھا لیکن دست اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنا چھپا ہوا دیوان دیکھ سکتے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

نور کا تیرے ازل سے آفتاب آئینہ تھا
لاجواب آئینہ ہی تھا، لاجواب آئینہ تھا
طالع بیدار نے دیکھا کھلی آنکھوں تجھے
تھی تری تصویر تعبیر اور خواب آئینہ تھا
دیدۂ جوہر نہ تھے، آنکھیں ہی آنکھیں تھیں کھلی
دیکھنے والوں کی نظروں کا حساب آئینہ تھا
تو نے یوں دیکھا کہ منہ پانی میں دیکھیں جس طرح
آب و تابِ حسن سے کیا آب آب آئینہ تھا
عکسِ خال و خط تھے سب روئے کتابی کے عیاں
ایک صفحہ تھا مگر پوری کتاب آئینہ تھا
اپنے گھر میں رہنے پر بھی در بدر پھرتا رہا
سخت حیرت ہے عجب خانہ خراب آئینہ تھا
بن کے حیرت خانہ میں آیا جو وہ صورت سوال
سارے غائب تھے مگر حاضر جواب آئینہ تھا

صبح ہونے کو ہے دیکھیں دیکھتا ہے وہ کسے
شام سے میں جاگتا تھا ، محو خواب آئینہ تھا
جس نے دیکھا اس کو آنکھوں ہی میں اے ناظم رکھا
مردمک تصویر تھی ، چشمِ پُر آب آئینہ تھا

گھر کرتے ہیں دلوں میں پھر آن بان والے
سکنے بٹھا رہے ہیں نام و نشان والے
تیر نظر سے تیرے ابرو کمان والے
بچتے نہیں کبوتر اونچی اڑان والے
آساں نہ قتل ہوں گے ہم سخت جان والے
بیڑا نہ تو اٹھانا او دھان پان والے
کب تک رہیں سنبھالے سر پر ہمارے نالے
اپنی زمیں اٹھا لے او آسمان والے
اوساں نہ ہار دینا مقتل میں عشق بازو
تیغیں ہیں باڑھ والی ، خنجر ہیں سان والے
میں اور صبر میرا آفت نصیب دونوں
اک تیغ ایک قاتل دو امتحان والے
شیرینیٔ سخن کی گر چاشنی بھی آئے
پھیکے پڑیں گے ناظم اونچی دکان والے

اپنی ایک غزل کو تضمین کرکے مخمس بنایا تھا ۔ چند بند ملاحظہ ہوں :

درد ہوں ، پوچھنے آؤ تو دوا بن جاؤں
آہ ہوں ، پاس بلاؤ تو رسا بن جاؤں

چاہ ہوں ، چاہو تو سائے سے ہما بن جاؤں
عشق ہوں ، حسن دکھاؤ تو ادا بن جاؤں
دل ہی مٹھی میں جو لے لو تو حنا بن جاؤں

ہم تمھیں چاہتے ہیں ، آپ بھی ہم کو چاہیں
گھر نہیں تو نہ سہی ، ملنے کو ہیں درگاہیں
بندشوں پر بھی نکل آتی ہیں لاکھوں راہیں
کھل کے ملیے تو نہیں بند گریباں باہیں
چھپ کے آغوش میں رہیے تو قبا بن جاؤں

محوِ دیدار ہوں ، دیدار ہے دولت میری
دل میں آنکھوں میں سماؤ ہے یہ حسرت میری
منتظر حکم کی رہتی ہے طبیعت میری
اک اشارے سے بدلتی ہے حقیقت میری
آنکھ ہوں ، چاہو تو نقشِ کفِ پا بن جاؤں

آئینہ سامنے رکھا ہوا ہے منگوا کر
ابھرے جوبن پہ نظر کرتے ہیں سر نہوا کر
چاہیے اس بتِ خود بین کے آگے جا کر
آنکھ پڑتے ہی تڑپ جاؤں گروں غش کھا کر
بگڑے بیٹھے ہیں وہ ، میں بھی تو ذرا بن جاؤں

حسن جادو ہے کہ اعجاز جہاں ہے خادم
اسی محرابِ عبادت کے ہیں سجدے لازم
حاجی و زاہد و سالک ہیں اسی کے خادم
ہے خدائی میں حسینوں کا تسلّط ناظم
بت ہوں قابو میں تو بندے سے خدا بن جاؤں

مرا نالہ ہے پر تاثیر ، دیکھا چاہیے کیا ہو
ہلا دی عرش کی زنجیر ، دیکھا چاہیے کیا ہو
ابھی آغاز ہے فرہاد کا ہے سنگ پر تیشہ
ترا انجام جوئے شیر دیکھا چاہیے کیا ہو
برا تو لکھ نہیں سکتا کہ لکھنے والا اچھا ہے
مقدر کی مرے تحریر دیکھا چاہیے کیا ہو

وہ چراغِ ادب ، جس نے پنجاب کی محفل ادب کی قندیلیں روشن کیں ، اپنے متعلق کہتا ہے اور صحیح کہتا ہے :

پسِ فنا بلبلیں کہیں گی ، تھے کیسے رنگیں مزاج ناظم
بسے چمن میں تو بوئے گل تھے ، رہے گلوں میں تو رنگ ہو کر

شیخ الٰہی بخش رفیق :

شیخ الٰہی بخش رفیق خلف سالار بخش متوطن میرٹھ مقیم لاہور بھی پنجاب کے شعرا میں نامور گزرے ہیں ۔ یہ کہنے کو تو تمباکو فروش تھے مگر فطری شاعر تھے اور فی‌الواقع طباع اور نکتہ سنج بزرگ تھے ۔ ۱۸۴۱ع میں پیدا ہوئے ۔ شروع میں میر مہدی حسن فراغ کو اپنی غزلیں دکھائیں ۔ بعد میں شاعری کے چشم و چراغ مولانا محمد حسین آزاد کی شاگردی اختیار کرکے ان کے ساتھ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظمیں پڑھیں ۔ ''خمخانۂ جاوید''[1] کا بیان ہے کہ رفیق نے ۱۸۸۲ع کے قریب انتقال کیا ، مگر یہ سنہ کئی لحاظ سے غلط ہے ۔ اول تو اس بنا پر کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں جو کلام پڑھا جاتا تھا ، وہ ان کے رسالہ ''گلدستۂ سخن'' میں ،

۱۔ خمخانۂ جاوید ، جلد سوم ، ص ۴۸۵ ۔

جو ڈاکٹر لائٹنر کی طرف سے شائع ہوتا تھا، باقاعدہ چھپتا رہتا تھا۔ مارچ ۱۸۸۸ء تک ان کا کلام برابر چھپتا رہا ہے۔ پھر خان احمد حسین خاں فرمایا کرتے تھے کہ شیخ الٰہی بخش رفیق، انجمنِ اتحاد کے مشاعروں میں بھی خوب رنگ جماتے تھے۔ یہ مشاعرے ۱۸۹۰ء میں شروع ہوئے۔ گویا وہ اس کے بعد ہی فوت ہوئے ہوں گے۔ خان احمد حسین خاں مرحوم نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کا انتقال ہیضے سے ہوا۔ مرتے وقت یہ قطعہ ان کی زبان پر جاری تھا:

کشتیٔ عمر سے اترے عدم آباد آیا
بحرِ ہستی کا کنارہ دلِ ناشاد آیا
شکر صد شکر کہ آیا ملک الموت رفیق
آج اس وعدہ فراموش کو میں یاد آیا

تارا چند تارا جو دہلی دروازہ میں سوہن حلوہ بیچا کرتے تھے، شاعری میں ان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے دیوان کے ساتھ اپنے استاد کا دیوان بھی طبع کرایا تھا۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اپنے ایک مقالہ ''نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ'' میں، جو ان کی کتاب ''منشورات'' میں شامل ہے، فرماتے ہیں:

''حضرت رفیق کون صاحب تھے؟ یہ نہ معلوم ہو سکا۔ آیا حضرت آزاد سے ان کا کچھ تعلق تھا یا نہیں۔ انداز گفتار یہ کہ آزاد کی زبان اڑانا چاہتے ہیں مگر وہ بات نہیں پا سکے۔ ان کی طبیعت میں آپچ ضرور ہے اور اچک بھی، لیکن کلام میں پست و بلند موجود ہے۔ بعض اشعار کے

ہے کربلائے عشق گلی اس نگار کی
پانی کے بدلے خون کی بہتی ہیں نالیاں
کم اے رفیق ہیں کمر یار کی طرح
حاسد یہ دیکھ کر تری نازک خیالیاں[۹]

دل کا معاملہ جو ہر اک پیچ دار ہے
شاید شبِ فراق مری زلف یار ہے
واں ہاں ملاؤ خاک میں دشمن کے نام کو
رکھو مری طرف سے جو دل میں غبار ہے
ہر اشک بے قرار ہے پردے میں آنکھ کے
مد نظر جو کوئی بتِ پردہ دار ہے
دیوانہ ہوں میں کس گلِ نازک مزاج کا
موجِ نسیم بھی مجھے خنجر کی دھار ہے
جب انتظار یار تھا ، پہلو میں دل بھی تھا
اب دل کا انتظار ہے ، پہلو میں یار ہے
وہ اپنے تشنگانِ محبت کو دیکھ کر
کہتے ہیں میری تیغ نہیں آب دار ہے
تیری گلی کی خاک میں خاک اپنی مل گئی
اب تو قدم قدم پہ ہمارا مزار ہے
گن گن کے کاٹتا ہوں یہ گھڑیاں فراق کی
میرے لیے تو روز ہی روز شمار ہے

۹۔ ماخوذ از گلدستۂ سخن ، مطبوعہ انجمن پنجاب ، مارچ ۱۸۸۸ء ۔

یہ کس کی شوخیوں کا خیال آ گیا رفیق
جو دل کی آرزو ہے، سراپا نگار ہے[1]

وہ بے قرار ہوں سوئے جنت جو کل گیا
تصویر بھی لیے تری زیرِ بغل گیا
تو بھی تو چل کے دیکھ سنبھالا لیا نہ ہو
کیونکر ترا مریضِ محبت سنبھل گیا
نیرنگ دو جہاں ہے ترا حسنِ دلفریب
عالم کو یار بن کے چھلاوا سا چھل گیا
دل میں عدو کے طفلِ غم اپنا خدا کی شان
موسیٰ کی طرح گھر ہی میں دشمن کے پل گیا
دفتر کھلا ہے یار کی رحمت کا اے رفیق
تو لے کے آج کیوں نہیں فردِ عمل گیا[2]

خود نمائی انھیں منظورِ نظر ہے ایسی
پھروں آئینے میں آپ اپنی پھبن دیکھتے ہیں
آ نکل تو بھی کبھی جانب دشت اے لیلیٰ
آ کے پھروں ترے مجنوں کو ہرن دیکھتے ہیں

آرزو دل کی بر آتی ہے دعا سے پہلے
مینہ برستا ہے مرے گھر میں گھٹا سے پہلے

۱- ایضاً -
۲- ماخوذ از "گلدستہ سخن" نمبر ۴، بابت مارچ ۱۸۸۰ع جو ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن پنجاب سے شائع کیا -

اب تو خنجر ترا اک اک کو ہے کرتا سیراب
تشنہ لب سینکڑوں مر جاتے ہیں پیاسے پہلے
میں بھی گلشن میں کوئی نالہ کروں یا نہ کروں
پوچھ لوں بلبلِ بے برگ و نوا سے پہلے
ہے دلِ زار چراغِ سحری کا عالم
خود بخود گل ہوا جاتا ہے ہوا سے پہلے
اے گلو مدِ نظر ہے جو لباسِ رنگیں
رنگ دے لو اسے خونِ شہدا سے پہلے[1]

انجمن اتحاد کے مشاعرے :

انجمنِ پنجاب کے مشاعرے بند ہو گئے تو لاہور پر سکوت چھا گیا اور وہ سونا سونا نظر آنے لگا ۔ ان حالات میں ایک ہفتہ وار مشاعرہ ''انجمنِ اتحاد'' کے اہتمام سے بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں قائم ہوا ۔ اس مجلس کی بنیاد حکیم شجاع الدین محمد نے ۱۸۹۰ء میں رکھی ۔ موصوف اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب ، فلسفی اور ادیب تھے ۔ سخن فہمی اور سخن گوئی دونوں میں مہارت کامل رکھتے تھے ۔ ''خزینۂ حزینہ'' اہلِ بیت علیہم السلام کے مرثیوں پر مشتمل مجموعہ اور ''داغ ہجراں'' ان کے اشعار کا دیوان ان کی شاعری کی یادگار ہیں ۔ انھوں نے اردو زبان کی روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر فارسی اور عربی میں شعر کہنا چھوڑ دیا اور یہ بزم مشاعرہ قائم کی ۔ ہمارے دور کے مشہور فاضل اور ڈراما نویس حکیم احمد شجاع انھی کے فرزند تھے ۔

''انجمن اتحاد'' کے مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء

۱- خمخانۂ جاوید ، جلد سوم ، ص ۲۸۶ ۔

کے مکان پر ہوتے تھے اور جو کلام یہاں پڑھا جاتا تھا وہ ''شور محشر'' رسالے میں شائع کر دیا جاتا تھا ۔ طرحی غزلوں کا یہ گلدستہ ہر ماہ خان احمد حسین خاں بی ۔ اے ۔ کی ادارت میں انجمن کی طرف سے نکلتا تھا ۔ خان احمد حسین خاں اس مجلس کے روح و رواں تھے ۔ وہ ایک ناول نویس ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔ انھوں نے بعد میں اپنا رسالہ ''شباب اردو'' بھی جاری کیا ، جو بہت مقبول ہوا ۔ وہ عاشقانہ اور طرز جدید دونوں رنگوں میں حق خوش گوئی ادا کرتے تھے اور مرزا ارشد گورگانی کے ارشد ترین تلامذہ میں شمار ہوتے تھے ۔ یکم جنوری ۱۹۵۷ع کو چار بجے صبح لاہور میں انتقال فرمایا ۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر نوے برس کے لگ بھگ تھی ۔ آپ نے کچھ عرصہ منصف کے فرائض بھی انجام دیے ۔ ساٹھ برس کے قریب اردو ادب اور صحافت کی خدمت کی ۔ سینکڑوں کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں جن میں ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''آب بقا'' بہت مشہور ہے ۔

مقامی شاعروں کے علاوہ مرزا ارشد گورگانی دہلوی خاص طور پر ان مشاعروں میں شرکت کے لیے فیروز پور سے لاہور آیا کرتے تھے ۔ ان کے شاگرد بھی اچھی خاصی تعداد میں شریک ہو کر مجلس کی رونق بڑھاتے تھے ۔ یہ سب دہلی سکول کے پیرو تھے ۔

میر ناظر حسین ناظم مالک و مدیر اخبار ''ناظم الهند'' لاہور ، لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ تھے ۔ ان کے بھی بہت سے شاگرد ان مشاعروں میں شامل ہوتے تھے ۔ بقول حکیم احمد شجاع ''دونوں کی ٹولیاں جب اس بزمِ مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے مصروفِ غزل خوانی ہوتی تھیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا ۔ لطف یہ ہے کہ

اس زمانے میں میر اور میرزا بھی ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے اور پنجاب کے شعرا بھی میر اور میرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروف پیکار تھے۔ بہرحال اس بزم کی رونق اسی ہنگامے پر موقوف تھی اور جب تک یہ ہنگامہ جاری رہا، "شور محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔[1]

"شور محشر" کے پہلے شمارے میں اس بزم کے پہلے مشاعرے کی جو روئداد چھپی تھی، اس کے مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس میں اس زمانے کے کیسے کیسے نامور لوگ شامل ہوتے تھے اور اردو زبان اس وقت پنجاب میں کس حد تک مقبول ہو چکی تھی:

> "۳۰ نومبر ۱۸۹۵ء کو پہلا جلسہ مشاعرے کا حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لاء کے عالی شان مکان پر شام کے چھ بجے ہوا۔ اس جلسے میں علاوہ مفصلہ ذیل اصحاب کے قریباً تین سو شائقین کی بھیڑ بھاڑ تھی:

۱۔ جناب حکیم شجاع الدین صاحب شجاع، میرِ مشاعرہ۔
۲۔ جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب محبوب۔
۳۔ جناب مرزا عبدالغنی صاحب ارشد دہلوی۔
۴۔ جناب منشی محبوب عالم صاحب مالک پیسہ اخبار۔
۵۔ جناب منشی عبدالعزیز صاحب منیجر پیسہ اخبار۔
۶۔ جناب لالہ موہن لعل صاحب مطلب نائب میر مشاعرہ۔
۷۔ جناب میر نثار علی صاحب شہرت (دہلوی)
۸۔ جناب مولوی احمد دین صاحب بی۔ اے۔ پلیڈر۔

۱۔ خون بہا، ص ۱۹۷۔

۹- لالہ دھنپت رائے صاحب بی - اے ، ایل - ایل - بی -
۱۰- جناب منشی میراں بخش صاحب بیرسٹرایٹ لاء -
۱۱- جناب میر ناظر حسین صاحب ناظم -
۱۲- جناب لالہ منوہر لال صاحب بی - اے -
۱۳- جناب مرزا محبوب بیگ صاحب بی - اے -
۱۴- جناب پنڈت سکھ چین ناتھ صاحب ایم - اے -
۱۵- جناب لالہ گوبند رام صاحب رئیس لاہور -
۱۶- جناب لالہ دل باغ رائے صاحب مالک البرٹ پریس لاہور -
۱۷- جناب شیخ دانش مند سقراط صاحب ایم - اے -
۱۸- جناب منشی شام لال صاحب مجبور -
۱۹- جناب مرزا عبدالحسین صاحب عارف -
۲۰- جناب حکیم شہباز دین صاحب -
۲۱- جناب فقیر سید زین العابدین صاحب پلیڈر -
۲۲- جناب منشی غلام حسین صاحب شیدا -
۲۳- جناب شہزادہ محمد علی صاحب المتخلص بہ شہزادہ -
۲۴- جناب آغا سلطان علی صاحب کربلائی -
۲۵- جناب سردار گنڈا سنگھ صاحب مشرق -
۲۶- جناب مولوی عبدالرؤف خاں صاحب رافت بھوپالی ، ایڈیٹر پیسہ اخبار -
۲۷- جناب فقیر سید اقتدار الدین صاحب -
۲۸- جناب خلیفہ نظام الدین صاحب -
۲۹- جناب حکیم امین الدین صاحب بیرسٹرایٹ لاء ، سیکریٹری -
۳۰- جناب منشی احمد حسین خاں احمد صاحب اسسٹنٹ سیکریٹری -

اس بزمِ مشاعرہ کی اہمیت اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ اس میں حضرت امیر مینائی ، جو اس زمانے میں رام پور سے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے ، نہ صرف شریک ہی ہوئے بلکہ مصرع طرح پر ایک غزل بھی لکھی اور خود پڑھی - پھر اس کے بعد کے مشاعرے میں ، جو غالباً ۱۸۹۶ء میں ہوا اور جس کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی :

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے[1] :

نسیم[2] و تشنہ[3] ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخن داں کا

۱- ''شور محشر'' (مشاعرۂ لاہور کا ماہوار رسالہ) دسمبر ۱۸۹۶ء - لاہور کا چیلسی ، مطبوعہ نقوش لاہور ، شمارہ ۱۰۴ ، جنوری ۱۹۶۶ء ، صفحات ۳۲ - ۳۳ -

۲- ۳- سید شبیر حسین صاحب نسیم بھرت پوری اور تشنہ بلند شہری فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - نسیم مرحوم کی پرانے رنگ کی شاعری دل میں چٹکیاں لینے کے لحاظ سے اپنے استاد کی شاعری سے بہت ملتی جلتی تھی - مرحوم ''دہلی پنچ'' اور ''مخزن'' لاہور کے مضمون نگار بھی تھے - نمونۂ کلام یہ ہے :

مریں گے تو تجھ پر مریں گے مری جاں
جئیں گے تو تیری تمنا کریں گے

فکر دنیا ، فکر عقبیٰ ، فکر دشمن ، فکر دوست
یہ بکھیڑے چار دن کی زندگی کے واسطے

جاتے ہو جو گھر جاؤ ، پر وعدہ یہ کر جاؤ
جب یاد میں آ جاؤں ، ملنے کی دعا کرنا

اتنی حجت ساقیا اک جام پر آج ہلوا دے خدا کے نام پر

پوری غزل حسبِ ذیل ہے :

تصور بھی جو بندھتا ہے تو خالِ روئے جاناں کا
بلندی پر ستارا ہے شبِ تاریکِ ہجراں کا
نقاہت قیس کی بولی جو گزری پاس سے لیلیٰ
ذرا دامن بچانا یہ بھی کانٹا ہے بیاباں کا
جو ڈالی خاک مٹھی سے کہا نالوں نے چلّا کر
تجھے آتا نہیں سر پر اٹھا لینا بیاباں کا
اڑا جب طائرِ رنگِ حنا لیلیٰ کے ہاتھوں سے
وہیں پھندا بنایا قیس نے تارِ گریباں کا
جنوں کو زخم دل کہتا ہے قائل میں بھی ہوں تیرا
جو پھاہا بن کے آ نکلے کوئی پرزہ گریباں کا
جو وحشت میں کبھی موئے میان یار کو دیکھا
جنوں کہنے لگا یہ تار ہے تیرے گریباں کا
یہی کہتا ہے چاکِ دامنِ یوسف، زلیخا کو
مجھے ٹانکا لگے تارِ نگاہِ پیرِ کنعاں کا
سمجھ کر اختر قسمت اٹھا لیتے ہیں ہم اس کو
ستارا جب گرا کوئی ترے ماتھے کی افشاں کا
جنوں! تیرِ نگاہِ ناز نے چھلنی کیا سینہ
نہیں مشکل رہا اب چھاننا خاک بیاباں کا
کبھی تیرِ جنوں دل میں ترازو ہو ہی جائے گا
کبھی کام آ ہی جائے گا مرے کانٹا بیاباں کا
حیا مانع رہی لیکن ادھر جذبِ محبت تھا
کسی نے اٹھ کے آخر روزنِ دیوار سے جھانکا

دمِ زورِ جنوں آخر اسی سے سر پٹکتا ہوں
مرے سر پر بڑا احسان ہے دیوارِ زنداں کا
رقیبوں کو جلاتی ہے، تمھیں بیتاب کرتی ہے
تمھی کہہ دو اثر کیا کم ہے میری آہ سوزاں کا
غضب ہوگا کہیں اب وصل کا وعدہ نہ کر دینا
کہ خوگر ہوگیا ہوں میں شبِ تاریکِ ہجراں کا
برا ہو بدگمانی کا اسی پر آنکھ رہتی ہے
نگہباں جانتے ہیں وہ مجھے اپنے نگہباں کا
بدل جائے اگر میرا مقدر اس کی قسمت سے
قدم آنے نہ دوں تیری گلی میں ایسے درباں کا
سمٹ کر تنگیٔ دل سے سویدا بن گیا آخر
خیال آیا اگر دل میں تری زلفِ پریشاں کا
مزا انکار میں ہے وصل کے اقرار سے بڑھ کر
کرشمہ ہے یہ سب شیرینیٔ تقریر جاناں کا
ہماری شوربختی کا اثر اتنا تو ہو یا رب
نہ ہو زخمِ جگر محتاج قاتل کے نمک داں کا
نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا"

اس مجلس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں ہر فرقے اور ہر خیال کے شاعر اور سخن فہم بلا تفریقِ مذہب و ملت شریک ہوتے تھے۔ کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق میں چلے آتے تھے اور سخن دانی کی داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ ان نوجوان مشتاقانِ سخن میں اقبال بھی تھے۔ حکیم احمد شجاع مرحوم اپنی کتاب "خوں بہا"

میں لکھتے ہیں :

''سر محمد اقبال نے ، جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے ، اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی ۔ اتفاق کی بات ہے جس سال میں پیدا ہوا ، اسی سال اقبال نے اسی مشاعرے میں وہ شعر پڑھا ، جس کا چرچا بہت دیر تک اربابِ ذوق کے حلقوں میں رہا ۔ ان کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس واقعے کے بیس برس بعد سر محمد اقبال نے ایک دن مجھ سے کہا ''تم اور میری شاعری ہم عمر ہو ۔ تم دونوں کی جوانی سدا بہار ہے ۔''

مجھے اس زیبِ داستاں بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں کسی حد تک تامل ہے ۔ بات یہ ہے کہ حکیم صاحب نے اپنی پیدائش کی تاریخ یکم صفر المظفر ۱۳۱۲ ہجری بتائی ہے جو مطابق ہے ۱۸۹۴ عیسوی کے ۔ اس وقت اگرچہ لاہور میں مشاعرے ہوتے تھے مگر اقبال ابھی سیالکوٹ ہی میں زیر تعلیم تھے ۔ وہ سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف ۔ اے ۔ پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء کے آخر میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے بی ۔ اے ۔ کا امتحان ۱۸۹۷ء میں پاس کیا ۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء سے پہلے لاہور نہیں آئے ۔ پھر وہ ۱۸۹۳ء کے مشاعروں میں کیسے شریک ہوئے ۔

جہاں تک اقبال کے اپنے بیان کا تعلق ہے ، وہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے ۱۸۹۳ء کے لگ بھگ سیالکوٹ میں

شعر کہنے شروع کر دیے تھے اور اس لحاظ سے ان کی شاعری اور حکیم صاحب ہم عمر تھے اور دونوں کی جوانی سدا بہار تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال پہلے پہل ۱۸۹۶ع کے کسی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد برابر شریک ہوتے رہے۔

انھی دنوں ایک طرحی مشاعرے میں مرزا خادم حسین صاحب آہاد رئیسِ اکبر آباد نے یہ شعر پڑھے:

شیریں نہ کس طرح صفتِ لب میں شعر ہوں
ٹوٹے ہوئے ہیں آم یہ سب ایک ڈال کے
دب جائیں ہم ، مزاج ہمارا بھی وہ نہیں
بولا کرو زبان تم اپنی سنبھال کے
ایک ایک شعر میری غزل کا ہے منتخب
ٹوٹے ہوئے یہ پھل ہیں سبھی ایک ڈال کے
نوکر نہیں ، غلام نہیں آپ کا کوئی
بولا کریں حضور ذرا منہ سنبھال کے

اور اقبال نے یہ غزل سنائی:

تم آزماؤ ''ہاں'' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ ''وصال'' کے
کم بخت اک ''نہیں'' کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوال ''وصال'' کے
ہم موت مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے کسی نے اور ہی معنے ''وصال'' کے
اے ضبط ہوشیار! مرا حرف مدعا
قابو میں آ نہ جائے زبانِ سوال کے

مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کر
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے
ان کی گلی میں اور کچھ اندھیر ہو نہ جائے
اے ضعف دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
میں نے کہا کہ بے دہنی اور یہ گالیاں
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
کہتے ہیں ہنس کے جائیے ، ہم سے نہ بولیے
قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے
بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے تھے تم تو کسی بے مثال کے
کہتا ہے خضر دشت جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے
اقبال لکھنؤ سے ، نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس غزل کے مقطع میں اقبال نے میر و مرزا کی چپقلش اور دلی اور لکھنؤ سکول کے جھگڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا مسلک بڑی خوبی سے واضح کیا ہے ۔ یہ غزل ''بانگِ درا'' میں درج نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس غزل کے بعض اشعار پر مرزا ارشد گورگانی بھڑک اٹھے تھے اور آپ نے اس شعر پر :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بے ساختہ داد دیتے ہوئے فرمایا تھا :

''میاں صاحبزادے ! اس عمر میں اور یہ مضمون ! اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ۔''

اس شعر کا اثر یہ ہوا کہ تمام اہلِ قلم کی نگاہیں یک بہ یک اقبال کی طرف اٹھنے لگیں ۔

نواب سر محمد ذوالفقار علی خاں نے جب انگریزی زبان میں اپنی کتاب ''اے وائس فرام دی ایسٹ'' لکھی تو اس شعر کی شرح کرتے ہوئے شاعر کی خدمت میں یوں خراجِ عقیدت پیش کیا :

''شاعر نے صرف ایک شعر میں ، جو بدرجۂ غایت لطیف ہے ، نجات کے بعد روح کی ملکوتی پاکیزگی کی شرح کر دی ہے ۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی محبت انھی لوگوں کے لیے ہے جو اپنے گناہوں پر انفعال و ندامت کرتے ہیں ۔ پسینے کے قطروں کی موتیوں سے تشبیہ نہایت لطیف ہے کیونکہ خوابیدہ ضمیر جب بیدار ہوتا ہے تو اس کی پاکیزگی موتیوں سے پوری مشابہت رکھتی ہے ۔ اس شاعرانہ حسنِ تعلیل نے روحِ انسانی کی عظمت ایسے حسین پیرائے میں پیش کی ہے کہ کوئی شخص اس سے لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔''

جب ہر طرف سے واہ وا ہونے لگی ، تو ایک مشاعرے میں اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کے دو شعر یہ ہیں :

مجھ کو صیّاد تہِ دام پھڑک جانے دے
میں نہ گلشن میں رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

شعر، اقبال کو آتا نہیں کہنا لیکن
تم جو کہتے ہو سخنور تو سخنور ہی سہی

سر عبدالقادر مرحوم یہ شعر اس طرح پڑھتے تھے:

خوب سوجھی ہے نہ دام پھڑک جاؤں گا
میں چمن میں نہ رہوں گا تو مرے پر ہی سہی
شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن
آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی

اور فرماتے تھے کہ اس ''سخنور ہی سہی'' کے ٹکڑے پر ایک شور مچ گیا تھا۔ یہ غزل بھی آپ کے کسی مجموعۂ کلام میں نہیں ملتی۔

۱۸۹۶ع کے آخر میں حکیم شجاع الدین محمد کا انتقال ہو گیا اور انجمن اتحاد کو بڑا صدمہ پہنچا۔ حکیم امین الدین بیرسٹرایٹ لاء نے کچھ عرصہ اس کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر انہیں پشاور جانا پڑ گیا جس سے ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔ حکیم صاحب علم و فضل میں کامل مانے جاتے تھے۔ ان کی ذکاوت اور طلاقت اس وقت خاص طور پر مشہور تھی۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں ان کی تقریریں بڑے شوق سے سنی جاتی تھیں۔ ان کی معلومات وسیع اور تنقید گہری ہوتی تھی۔ وہ جب کبھی لاہور آ جاتے تھے تو ان کی موجودگی سے اس محفلِ ادب کی رونق میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

حکیم امین الدین کی عدم موجودگی میں حکیم شہباز الدین نے اس کام کو سنبھالا مگر بقول حکیم احمد شجاع مرحوم:

''جذب صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی، وہ اس نوجوان کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی۔ حکیم شہباز الدین بہت ہی لاغر اور نحیف انسان تھے، مگر ان

کے سینے میں ایسا دل تھا جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی ۔ وہ جو کچھ کماتے ، اپنے احباب کی خاطر مدارات میں صرف کر دیتے ۔ ان کی زبان کی شیرینی ، منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ان کے گھر کو علم و ادب کے شیدائیوں کا مرجع بنا دیا تھا جن کی دید کے شائق دور دور سے ان کے مکان پر آتے اور ان کی صحبت سے اکتسابِ شرف کرتے تھے ۔''

حکیم شہباز الدین صاحب خود بھی شعر کہتے تھے ۔ ایک نہایت ہی مختصر نظم ''تاروں بھری رات'' سے ان کی طبیعت کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے گا ۔ فرماتے ہیں :

کھینچتی ہے شبِ تاریک سوئے چرخ کہن
کہ ستارے عجب انداز سے ہیں نور فگن
نور سے ان کے قدامت کے ہیں روشن آثار
ان کی رفتار دکھاتی ہے کچھ اگلا سا چلن
نہیں معلوم کہ روشن ہیں یہ کن وقتوں سے
نہیں معلوم کہ کب تک یہ رہیں گے روشن
جگمگاہٹ کی ہے کچھ ان کی نرالی ترکیب
چشم بیدار میں جوں سنتریوں کے چتون

مشاعرے بند ہو گئے ، ''شورِ محشر'' کی اشاعت بھی رک گئی مگر ایک بات ضرور ہوئی کہ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزم مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اٹھانے اور کچھ سیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی ، اب وہ ہر روز حکیم شہباز الدین کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے تھے ۔ رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا ایک اچھا خاصا کلب بن گیا اور یہ سلسلہ

برسوں تک جاری رہا۔

یہاں جمع ہونے والے بزرگوں میں ایک ایک آسمانِ ادب کا درخشاں ستارہ تھا۔ شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری، شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی، سر شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش (جو اقبال کے ہم زلف خواجہ فیروز الدین بیرسٹرایٹ لاء کے والد تھے اور ڈپٹی کمشنر رہتک ہو گئے تھے)، خواجہ کریم بخش (جن کے صاحبزادے خواجہ عبدالمجید نے پولیس کے محکمے میں رہ کر ''جامع اللغات'' جیسی ضخیم لغت مرتب کی)، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین اکاؤنٹنٹ ریلوے، شیخ گلاب دین وکیل، مولوی احمد دین وکیل، سید محمد شاہ وکیل، (جن کی صاحبزادی باجی رشیدہ لطیف نے پنجاب کے علمی اور سیاسی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا)، زمیندار اخبار کے بانی مولوی سراج الدین احمد (جو ان دنوں محکمۂ رسل و رسائل میں ملازم تھے) اور ڈاکٹر محمد حسین خاں کے صاحبزادے خان احمد حسین خاں مدیر ''شباب اردو'' ان لوگوں میں سے تھے جو قریب قریب ہر شام کو اس بیٹھک میں جمع ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بعض کی جرأت تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ اقبال بھی جب تک ان بزرگوں کو اپنا کلام سنا نہ لیتے تھے، ان کی تسلی نہ ہوتی تھی اور وہ اسے کسی مجلسِ عام میں نہ پڑھتے تھے۔ 'نالۂ یتیم'، 'یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'، 'اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'، 'فریادِ امت'، 'تصویر درد' اور 'شمع اور شاعر' کی سی معروف نظمیں اقبال نے پہلے انھی لوگوں کے سامنے پڑھیں اور ان سے دادِ سخن پا کر پھر انھیں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں

پیش کیا - ان میں سے کچھ بزرگ تو ایسے ہیں جو بعد میں اس قدر مشہور ہوئے کہ ان کے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں کہ اپنی عزلت گزینی کے باعث چنداں معروف نہیں - اس لیے قارئین کی معلومات میں اضافے کی خاطر ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے چند مختصر سے اشارے کرنا بے جا نہ ہوگا -

مولانا عبدالحکیم کلانوری :

شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۶ء تک چوالیس برس صدر مدرس فارسی رہے - شکل صورت سے بہت وجیہ تھے - ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بڑے اعتماد سے بات کر رہا ہو - وہ جب آتے تو حضرت اقبال زیادہ تر انھی سے مخاطب ہو کر شعر و شاعری کے ادبی محاسن پر گفتگو کرتے - انھوں نے قواعد فارسی کے علاوہ عروض ، صنائع و بدائع اور املا کے خصائص پر کئی مفید رسالے لکھے جن سے فارسی ادب کے طلبا کو بہت فائدہ پہنچا -

مفتی عبداللہ ٹونکی :

شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے انتقال کے بعد عربی کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز کیے گئے - کچھ عرصہ انجمن حمایت اسلام کے صدر بھی رہے - وہ فقہ اسلامی کے بہت بڑے فاضل تھے - اسلامی قانون اور شرعی مسائل میں ان کی رائے سند مانی جاتی تھی - یہ بھی ہر شام اس بیٹھک میں آتے تھے اور ان کی باتوں سے ان لوگوں کو رہنمائی ملتی تھی جن کا پیشہ وکالت تھا یا جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو

سمجھنے کا شوق تھا ۔ ڈاکٹر اقبال اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اس ناتواں جسم میں علم و فضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا بند ہونے کی مثل ان پر صادق آتی ہے ۔"[۱]

مفتی صاحب کے صاحبزادے مفتی انوارالحق ، جنھوں نے "نسخۂ حمیدیہ" مرتب کیا تھا ، بھوپال میں ایک مدت تک ناظمِ تعلیمات رہے ۔ مفتی صاحب بھی ۳۴ سال تک اوریئنٹل کالج میں خدمت کرنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو کر پہلے دارالعلوم ندوہ ، پھر مدرسۂ عالیہ کلکتہ اور بعد میں بھوپال پہنچ گئے ۔ وہیں ۱۹۲۰ع میں رحلت فرمائی ۔ وفات کے وقت ان کی عمر ستّر برس تھی ۔

شیخ عبدالقادر :

شیخ سر عبدالقادر جن کا آبائی مکان بھاٹی دروازے کے اندر موتی ٹبے میں تھا ، ان دنوں بازار حکیماں میں فقیر جمال الدین کی حویلی کے سامنے میاں حسین بخش کے مکان میں رہتے تھے ۔ وہ اپنے علمی ادبی کارناموں کے علاوہ ان اعزازات کے باعث ، جو انھیں سرکار دربار میں حاصل ہوئے ، کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ۔ وہ ۱۸۹۴ع میں پنجاب یونیورسٹی سے بی ۔ اے ۔ کرنے کے بعد مسلمانوں کے پہلے انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔ اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں اردو زبان کی ترویج کی دھن سمائی اور ۱۹۰۱ع میں انھوں نے رسالہ "مخزن" جاری کرکے اس زمانے کے تمام ممتاز ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گرد جمع کر لیا ۔ ۱۹۰۴ع میں وہ انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس

۱۔ لاہور کا چیلسی ، مطبوعہ نقوش لاہور ، شمارہ ۱۰۴ ، جنوری ۱۹۶۶ع ۔

کرکے ۱۹۰۶ء میں واپس آئے۔ اقبال بھی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہے۔ وہاں کے قیام نے دونوں کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات پر غور و فکر کی دعوت دی۔ چنانچہ اقبال نے شیخ عبدالقادر کو دعوتِ عمل دیتے ہوئے ایک نظم میں کہا :

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلٰی بے کار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردئ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں ، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

چنانچہ جب تک دونوں جئے مسلمانوں کی بیداری کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ شیخ عبدالقادر نے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو رحلت فرمائی۔

چودھری شہاب الدین :

سر شہاب الدین بھی اُن دنوں بھاٹی دروازے کے اندر بازار سمیاں میں رہتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کرکے پولیس کی ملازمت اختیار کی۔ پھر ملازمت چھوڑ کر کچھ دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھایا۔ ۱۹۱۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کرکے ۱۹۱۲ء میں "پنجاب کریمنل لا جرنل" کے قام

سے ایک قانونی رسالہ جاری کیا جو بہت مقبول ہوا ۔ لاہور کی شہری اور پنجاب کی سیاسی زندگی میں عمر بھر نمایاں حصہ لیا ۔ کئی سال لاہور میونسپل کمیٹی کے صدر اور بائیس برس پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے صدر رہے ۔ پنجابی کے بڑے حامی اور مشہور شاعر تھے ۔ مسدس حالی کا پنجابی زبان میں لاجواب ترجمہ کیا ۔ اقبال کے ساتھ ان کے تعلقات اتنے بے تکلفانہ تھے کہ وہ جوں ہی حکیم شہباز الدین کی بیٹھک میں قدم رکھتے ، اقبال کو لطائف پر لطائف سوجھنے لگتے ۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۵ء کو لیڈی شہاب کے انتقال پر اقبال نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا جو مرحومہ کی قبر پر کندہ ہے :

چو رخت سفر بست سردار بیگم
ازیں دارِ فانی سوئے باغِ جنّت
بہ پس ماندگاں تلخ شد زندگانی
"ہجومِ غم و رنج" شد سالِ رحلت

۱۳۵۴ھ

سنِ عیسوی خواستم چوں ز ہاتف
بگفتا "بریں تربتِ پاک رحمت"[۱]

۱۹۳۵ء

چودھری صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا ۔ انھوں نے ہزاروں بیش قیمت کتابیں اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنائیں مگر وفات سے قبل وصیت فرمائی کہ یہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دیا جائے ۔ چنانچہ اب یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا سرمایہ ہے ۔

۱۔ باقیاتِ اقبال ، ص ۴۹۴ ۔

مولوی احمد دین :

مولوی احمد دین وکیل بھی اس محفل کا مستقل سنگھار تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے ایک سرگرم رکن ، باوقات مختلف انجمن کی سکولز سب کمیٹی ، تالیف و طبع کمیٹی اور اسلامیہ کالج کمیٹی کے سیکریٹری رہے۔ انھوں نے ایک نہایت مفید کتاب ''سرگذشت الفاظ'' لکھ کر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے ایک ہزار روپیہ انعام حاصل کیا۔ اس کتاب میں آپ نے ایک ہزار الفاظ کی ساخت ، تغیر و تبدل اور تاریخ بیان فرمائی ہے۔ اپنے فاضل استاد مولانا محمد حسین آزاد کے بعد مولوی صاحب کی یہ کتاب تحقیقاتِ لفظی اور علم اللسان کا بہترین نمونہ ہے۔

مولوی احمد دین کو اقبال سے بے حد محبت تھی۔ انھوں نے دیگر بے شمار کتابوں کے علاوہ ''اقبال'' پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا قصہ ایثار اور خلوص کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی تمام ابتدائی نظمیں اور غزلیں ، جو انھوں نے از راہ خلوص و محبت جمع کر رکھی تھیں ، شائع کر دی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ منتشر کلام جمع ہو کر دستبردِ حوادث سے محفوظ ہو جائے گا اور اقبال خوش ہوں گے کیونکہ اس وقت تک ان کے اردو کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا اور ان کی شاعری پر بھی کوئی مستقل کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔ مگر مولوی صاحب کا خیال غلط نکلا۔ انھیں مایوسی ہوئی ، کیونکہ جب کتاب چھپ کر اقبال کے پاس پہنچی اور شیخ گلاب دین نے اس کے متعلق اقبال کی رائے دریافت کی تو اقبال نے مذاق ہی مذاق میں

کہہ دیا کہ میں تو نظرثانی کے بعد اپنے کلام کا مجموعہ ابھی مرتب ہی کر رہا تھا کہ مولوی صاحب نے ''اقبال'' کو بیچنا بھی شروع کر دیا ۔ کم از کم وہ میری کتاب کا انتظار ہی کر لیتے ۔

مولوی صاحب نے جب یہ بات سنی تو اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا ۔ اقبال کا کلام چھاپ کر اقبال کو نقصان پہنچانا اور جو اشعار ان کے معیار سے گر چکے تھے ، انھیں محفوظ کرکے اقبال کی شہرت کو بٹّا لگانا ان کا مقصد نہ تھا ۔ انھوں نے کتاب کی تمام جلدیں اپنے مکان کے صحن میں ڈھیر کرکے ان کو آگ لگا دی ، خود کرسی بچھا کر ایک طرف بیٹھ گئے اور جب تک کتاب کا ایک ایک ورق جل کر راکھ نہ ہو گیا وہاں سے نہ ٹلے اور گھر پھونک تماشا دیکھتے رہے ۔

اقبال کو اس واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے بڑا افسوس ظاہر کیا ۔ مولوی صاحب سے معذرت طلب کرکے ان کو دوبارہ کتاب چھاپنے پر راضی کر لیا ۔ چنانچہ بانگِ درا کی اشاعت (۱۹۲۴ع) کے دو سال بعد ۱۹۲۶ع میں یہ کتاب از سر نو لکھی اور شائع کی گئی ۔ اس دفعہ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا ۔ صرف منتخب اشعار دیے گئے ۔ اس قسم کی اخلاقی بلندیاں آج کہاں دیکھنے میں آتی ہیں ۔

مولوی احمد دین نے ۱۱ - اکتوبر ۱۹۲۹ع (۶ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ) کو انتقال فرمایا[1] ۔ اقبال نے مرحوم کے بڑے صاحبزادے

۱- اخبار حمایت اسلام لاہور ، ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۹ع (مطابق ۱۲ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ) ۔

مولوی بشیر کو تعزیت کا حسب ذیل خط لکھا :

ڈاکٹر سر محمد اقبال - ایم - اے - پی ایچ - ڈی - ایل - ایل - سی
بیرسٹرایٹ لاء ، لاہور

"۱۱ اکتوبر ۲۹ء

عزیزم بشیر ! السلام علیکم

افسوس ہے کہ میں مولوی صاحب مرحوم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا - مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہو گیا ، جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی - حرکت سے قاصر رہا - دوسرے روز دانت کے درد کا بھی اضافہ ہو گیا - میں نے خواجہ صاحب (خواجہ فیروز الدین) کے ہم دست آپ کو اپنی معذوری کا پیغام بھی بھیجا تھا - معلوم نہیں کہ وہ پیغام آپ تک پہنچا کہ نہ پہنچا - بہرحال مجھے یہ افسوس تازیست رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری دعا جو کی گئی ، میں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا - خدا تعالٰی ان کو غریقِ رحمت کرے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے - کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد تھا مگر اس سے پہلے انجمن کے جلسے میں دیر ہو گئی - انشاء اللہ اب حاضر ہوں گا - امید ہے شام کے قریب آپ سب بھائی گھر پر ہوں گے - زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعائے صبرِ جمیل کے -

والسلام
محمد اقبال"

شیخ گلاب دین :

شیخ گلاب دین وکیل سیالکوٹ کے رہنے والے اور علامہ اقبال کے دوست تھے ۔ انھوں نے قانونِ شریعت و رواج اور قانونِ شہادت کا اردو میں ترجمہ کرکے بڑا نام پیدا کیا ۔ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال پی ایچ ۔ ڈی اور بیرسٹری کی سند لے کر لاہور واپس آئے تو شیخ گلاب دین نے ان کے اعزاز میں نہایت شاندار دعوت کا اہتمام کیا ۔

مولوی محمد حسن جالندھری :

مولوی محمد حسن جالندھری ، جو کسی مدرسے میں معلم تھے ، پنجاب کے قریب قریب ہر شریف گھرانے کی نظر میں قابل احترام اور محبوب بزرگ تھے ۔ ان کی باتیں درس اخلاق تھیں اور ان کی سیرت محاسنِ اسلامی کا آئینہ ۔ اس مجلس میں جو اسلامی رنگ نظر آتا تھا وہ انھی کے اوصاف و اطوار کا پرتو تھا ۔

مولوی محمد حسین :

شمس العلماء خان صاحب مولوی محمد حسین ایک اور بزرگ تھے جو گوجرانوالہ کے ایک بارسوخ علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ وہ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے ۔ بچپن میں اپنے والد مولوی سراج الدین سے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ پھر اورینٹل کالج لاہور سے مولوی فاضل ، قاضی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے ۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری مرحوم جیسے لائق اور فاضل استاد سے فیض پایا ۔ مولانا شبلی نعمانی اور پیر سید جماعت علی شاہ جیسی قابل شخصیتوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا فخر

بھی حاصل کیا - ۱۸۸۷ء سے ۱۹۲۲ء تک فارمن کرسچن کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے - پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی ہو گئے تھے - آپ عالمِ باعمل تھے - طالب علم آپ کی بے حد عزت کرتے تھے - سر میاں محمد شفیع اور سر شیخ عبدالقادر جیسے نامور بزرگ آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے - آپ کی تحمل مزاجی ، آپ کا سلیقہ اور طرز تعلیم ، آپ کی دین داری ، صوم و صلٰوۃ کی پابندی اور سادگی ، تلامذہ کے علاوہ دیگر ملنے والوں اور بالخصوص اس بیٹھک میں بیٹھنے والوں پر نہایت گہرا اثر ڈالتی تھی - آپ کی ظرافتِ طبعی کھانے میں نمک تھی - ''ارمغان احباب'' اور ''العجائب'' دو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں آپ کی یادگار ہیں - سرگزشت وزیر خاں لنگران پر حاشیہ بھی لکھا ہے - ۲ جولائی ۱۹۲۲ء کو اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے اپنے مکان واقع بھاٹی دروازہ میں انتقال کیا - نعش آپ کی گوجرانوالہ لے جا کر دفن کی گئی -[1]

میاں محمد شفیع اور میاں محمد شاہ دین ہمایوں :

سر میاں محمد شفیع بارایٹ لاء جو اُس زمانے کے ایک مشہور قانون دان تھے اور جو بعد میں اپنی قابلیت اور شہرت کی بدولت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ہو کر اپنی انارکلی والی بیٹھک اور اپنے تمام مقدمات اقبال کے سپرد کر گئے تھے اور میاں محمد شاہ دین ہمایوں جو پنجاب چیف کورٹ کے پہلے مسلمان چیف جج مقرر ہوئے تھے ، کبھی کبھی اس بزمِ علم و ادب میں شریک ہو

۱- رسالہ شباب اُردو لاہور ، دسمبر ۱۹۲۲ء -

کر اس کی رونق بڑھاتے تھے - ہمایوں مرحوم کو تو شاعری میں اچھی خاصی شہرت نصیب ہوئی اور ان کا مجموعۂ کلام بھی چھپ گیا لیکن سر محمد شفیع کے متعلق بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ بھی شعر کہتے تھے - ان کی ایک مختصر سی نظم کے چند شعر پیش خدمت ہیں - یہ نظم انھوں نے کشمیر کی وادیٔ لدر (پہلگام) کے حسن سے متاثر ہو کر کہی تھی :

یہ کشمیر کے دل کشا مرغزار
یہ پانی ، یہ شمشاد و سرو و چنار
یہ سرسبز دشت اور یہ کوہسار
سدا جن میں رہتی ہے گل کی بہار
ہیں بے شبہ جاں بخش و فرحت فزا
یہ سب ہیچ تجھ بن ہیں اے مہ لقا
یہ دلکش لدر کی ہے وادی جہاں
سہانا ہے قدرت نے باندھا سماں
زمیں ایسی پائے مسافر کہاں
کہے صنعتِ حق کی جو داستاں
گھری ہے پہاڑوں سے چاروں طرف
ہیں اشجار سرسبز یاں گل بکف

یہ اپنے اپنے کاروبار میں ہوشیار ، محنتی ، متین اور سنجیدہ بزرگ جب آپس میں مل جل کر بیٹھتے تھے تو معصوم بچوں کی طرح خوش ہوتے اور پُرشباب نوجوانوں کی طرح نشاط و انبساط کے زندہ پیکر بن جاتے تھے -

ایک یادگار تقریب :

انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ عیدِ رمضان کی تقریب پر حکیم امین الدین نے دعوت دی اور اپنے چیدہ احباب کو بلایا ۔ حاضرین کے نام یہ ہیں ـــــ نواب غلام محبوب سبحانی رئیس اعظم لاہور ، مولوی محبوب عالم مالک و مدیر پیسہ اخبار لاہور ، شیخ عبدالقادر ، شیخ محمد اقبال ، خان احمد حسین خاں ، خلیفہ نظام الدین ، مولوی احمد دین وکیل ، شیخ گلاب دین وکیل ، حکیم شہباز الدین ، خواجہ رحیم بخش ، منشی غلام محمد ناظم ، مرزا محبوب بیگ وکیل ور سید محمد شاہ کیل ۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عبدالقادر نے تجویز پیش کی کہ حضرت اقبال اور خان احمد حسین خاں فی البدیہ ایک ایک غزل کہیں اور سنائیں ۔ آپ نے مومن کا یہ شعر پڑھ کر اس کے دوسرے مصرع کو طرح مقرر کیا :

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیونکر
فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

حاضرین نے یک زبان ہو کر تائید کی ۔ چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی غزل کہہ کر سنائی جو اس پُر لطف محفل کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔

خان احمد حسین خاں نے کہا :

سردمہری سے تری سرد زمستاں ہوگا
گرم جوشی سے مری طور درخشاں ہوگا
چارہ گر دیکھ مرے درد کو بدنام نہ کر
درد وہ کیا ہے جو منّت کشِ درماں ہوگا

ماہ جو چرخ سے ہے طوف کو دیکھا کرتا
رخِ پُر نور پہ کیا تیرے وہ قربان ہوگا
کون کہتا ہے کہ دمدار ستارا نکلا
وہ کسی وجہ سے انگشت بدندان ہوگا
میر چشمی نے عطا مجھ کو وہ کی ہے دولت
خون بھی تھوکوں تو وہ لعل بدخشاں ہوگا
جانبِ ملکِ عدم ہم تو روانہ ہوں گے
حشر کیا آپ کا اے حسرت و ارمان ہوگا
داغ دل میں نے جو اترا کے دکھایا ان کو
ہنس کے فرمایا چراغِ تہِ داماں ہوگا
دشت غربت میں ہمیں ڈھونڈتا پھرتا ہے کوئی
یہ ترا سایہ ہی اے شامِ غریباں ہوگا
بلبلیں دور رہیں تجھ سے تو اچھا احمد !
ورنہ تو گل کی طرح چاک گریباں ہوگا

اقبال نے فرمایا :

لاکھ سرتاجِ سخن ناظمِ شرواں[1] ہوگا
پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا
مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا
عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا
کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی عریاں ہوگا

۱- ناظمِ شرواں سے مراد خاقانی شروانی ہے -

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنّتی ہوگا ، فرشتوں میں نمایاں ہوگا
کیا کہیں مست مئے عشق کہاں ہوتا ہے
بہ در دیرِ مغاں ناصیہ کوباں ہوگا
جیتے جی سر نہ جھکائیں گے کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا
زندگی چار دہاڑے ہے تو اس کی خاطر
بوالہوس ہوگا جو شرمندۂ احساں ہوگا
چار سو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اس بزم میں اقبال گل افشاں ہوگا

یہ غزل اگرچہ ابتدائی مشق کے زمانے کی ہے اور ارتجالاً کہی گئی ہے اور بعد میں بھی اقبال کے بلند معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے کسی مجموعے میں جگہ نہ پا سکی ، لیکن اس کے بعض بعض شعروں سے اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ اقبال ابتدا ہی سے چند خاص خیالات اپنے سامنے رکھتے تھے ، جنھوں نے آہستہ آہستہ پختہ ہو کر فلسفۂ اقبال کی صورت اختیار کر لی - 'خودی' اقبال کا خاص موضوع ہے - یہی ایک محور ہے جس کے گرد اقبال کا سارا فلسفہ گھومتا ہے - اگر اسے اقبال کی تعلیم سے خارج کر دیا جائے تو اقبال کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے - مثنوی اسرارِ خودی اگرچہ ۱۹۱۴ع میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی لیکن خودی اور خودداری کا ذکر اس غزل میں بھی موجود ہے - یہ اشعار دیکھیے :

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنّتی ہوگا ، فرشتوں میں نمایاں ہوگا

جیتے جی سر نہ جھکائیں گے کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا

پھر اس مضمون کو :

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا

اقبال نے اپنے آخری ایام میں فارسی کا جامہ پہنا کر ہمیشہ کے لیے اس طرح محفوظ کر دیا :

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ او[1]

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جب اس مردِ حق کا آخری وقت آیا تو اس نے ایک مردِ مومن کی طرح نہایت خندہ پیشانی سے موت کو لبیک کہا ۔

لٹریری سوسائٹی کا احیا :

جب ہر طرف سے مشاعروں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو ۱۸۹۷ع میں خان احمد حسین خاں نے نواب غلام محبوب سبحانی رئیس لاہور (خلف نواب شیخ امام الدین مرحوم گورنر کشمیر) کو سرپرست بنا کر مشاعروں کا سلسلہ از سرِ نو نواب صاحب کے اصطبل میں شروع کر دیا ۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ یہ اصطبل بھاٹی دروازے کے اندر اونچی مسجد کے قریب واقع تھا مگر بعض کہتے ہیں کہ نواب صاحب کا اصطبل لوہاری دروازے کے باہر انارکلی کے سرے پر اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل رائل ہوٹل یا سنٹرل

۱- ارمغانِ حجاز ۔

ہوٹل کی عمارت بنی ہوئی ہے - نواب صاحب خود بھی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے - دیوانِ محبوب مطبوعہ ۱۹۰۱ع ان کی یادگار ہے - وہ مشاعرۂ اتحاد یا لٹریری سوسائٹی کو اکثر زینت بخشتے اور اس میں اپنا فارسی کلام سناتے تھے - ان کا انتقال دربارِ دہلی کے موقع پر ہوا - ان کی نعش لاہور میں مزار سید علی ہجویری کے احاطے میں دفن کی گئی - نمونۂ کلام :

بوئے موئے تو ز مشک ختنے ساختہ اند
رنگ روئے تو زُدرِ عدنے ساختہ اند
دُرِ دندانِ تو برد آب ز الماس و گہر
لبِ لعلت چو عقیقِ یمنے ساختہ اند
چشم تو نرگس و لالہ لب و گیسو سنبل
عارضت عین گلے یاسمنے ساختہ اند
قامتت سرو رواں غنچہ دہن روئے تو گل
جان من جسم تو گویا چمنے ساختہ اند
جنّت از خاک در ہمچو توی شد پیدا
دوزخ از سوز دل ہمچو منے ساختہ اند
مطلبِ ہر دو یکے ہست ولے از پئے فصل
آں یکے شیخ ، دگر برہمنے ساختہ اند
جلوہ گر در ہمہ جا ہست جمال محبوب
نام بت خانہ و مسجد سخنے ساختہ اند

اے جاں فدائے غمزۂ آں دلربا شدی
اے دل شہیدِ خنجرِ ناز و ادا شدی

ناز و ادا و خشم و تغافل ، عتاب و قہر
گویا کہ جامعِ ہمہ جور و جفا شدی
شد زہرہ مشتری و سعادت ز بخت من
ز اندم کہ مہرباں بمن اے مہ لقا شدی
تشبیہ زلف یار کہ کردی بمشک چیں
محبوب زیں خیال غلط بر خطا شدی

بزمِ قیصری :

لٹریری سوسائٹی کے یہ مشاعرے کچھ عرصہ تو یوں ہی چلتے رہے لیکن شاعرانہ چشمک اور نوک جھونک کی بنا پر بعد میں اس کا ایک بازو کٹ کر علیحدہ ہو گیا جس نے ''بزمِ قیصری'' کی صورت اختیار کر لی ۔ اس بزم کے مشاعرے حضوری باغ میں ہوتے تھے ۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی اس کے کرتا دھرتا تھے ۔ ان کی طرف سے ''سخن'' کے نام سے طرحی غزلوں کا ایک ماہوار گلدستہ بھی شائع ہوتا تھا اور جو کلام ان مشاعروں میں پڑھا جاتا تھا وہ اس میں محفوظ کر دیا جاتا تھا ۔ مشاعرۂ اتحاد میں مرزا ارشد گورگانی مرحوم کے شاگردوں اور مداحوں کا زور تھا ۔ اس کٹاچھنی اور چھیڑ چھاڑ کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ ناظم صاحب کے ایک شاگرد غلام حسین خاں کا تخلص ارشد اور ارشد گورگانی کے ایک شاگرد منشی غلام محمد کا تخلص ناظم رکھا گیا ۔ غرض دونوں انجمنیں اردو علم و ادب کی خدمت کرنے اور لوگوں میں شعر و شاعری کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں ایک دوسری سے بڑھ جانے کی کوشش کرتی تھیں ۔ اتفاق سے رسالہ ''خدنگِ نظر'' فروری ۱۹۰۰ع میں منشی غلام حسین ارشد (بازار انارکلی لاہور) کی دو غزلیں نظر سے گزری ہیں جو بزمِ قیصری

کے مشاعروں کی یاد تازہ کرنے کے لیے ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

نہیں ہے تم سے گلہ کچھ کہ ہے خطا میری
سکھا رہی ہے جفائیں تمہیں وفا میری
کبھی تو اس بتِ کافر کے دل میں ہوگا اثر
قبول ہی کبھی ہو جائے گی دعا میری
دیا جو تجھ سے ستمگر کو جان بوجھ کے دل
ہوا قصور مرا ، یہ ہوئی خطا میری
مجھے ہے ڈر شبِ تاریک ہجر میں یا رب
نہ راہ بھول گئی ہو کہیں قضا میری
خدا ہی نے مجھے ارشد بچا لیا ورنہ
لبوں پہ ہجر میں جان آئی بارہا میری

دیگر

کیا کیا ہیں گل ہمارے دلِ داغ دار میں
آؤ کبھی تو سیر کو اس لالہ زار میں
اے موت جلد آ کہ ترے انتظار میں
ہے بے قرار جانِ حزیں جسمِ زار میں
قربان تیرے ہاتھوں کے مانی ! کہ شوخیاں
بھر دی ہیں کوٹ کوٹ کے تصویرِ یار میں
اخفائے رازِ عشق و محبت ہو کس طرح
کم بخت دل ہی جبکہ نہ ہو اختیار میں
بے جا ہے رنج و منصب و جاہ و حشم کہ تھا
ارشد یہی مشیتِ پروردگار میں[1]

۱- خدنگِ نظر ، فروری ۱۹۰۰ع -

چند یادگار طرحیں :

آن دنوں حضرت احسان شاہجہانپوری کی ادارت میں شاہجہانپور سے ''ارمغان'' نام کا ایک ماہوار رسالہ نکلتا تھا ۔ فروری ۱۸۹۸ع میں اس نے یہ مصرع طرح دیا :

''ملکِ سخن ہے آصفِ عالم پناہ کا''

یہ مصرع شہریار دکن میر محبوب علی خاں کی ذات سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس نے دنیائے شاعری میں ایک دھوم مچا دی ۔ ''ارمغان'' کے تین چار پرچے متواتر اسی طرح پر شائع ہوئے ۔ لاہور میں منشی محمد الدین فوق مرحوم کی تحریک سے اس طرح پر انجمن اتحاد کا ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا ، جس میں اکثر حضرات نے غزلیں پڑھیں اور خوب پڑھیں ۔ فوق صاحب نے خود دو غزلیں بقید قافیہ ''آہ'' اور ''نگاہ'' اور ایک غزل عام رنگ میں پڑھی جس کے دو شعر یہ ہیں :

کچھ اور بڑھ گئی شبِ فرقت کی تیرگی
سایہ جو پڑ گیا مرے بختِ سیاہ کا
اے فوق اب مزے سے کرو شغلِ شاعری
ملکِ سخن ہے آصفِ عالم پناہ کا

۱۹ اگست ۱۸۹۸ع کا مشاعرۂ اتحاد اس طرح کے لحاظ سے کہ :

''ناتوانی سی ناتوانی ہے''

گو ایک کمزور مشاعرہ سمجھا جائے لیکن شاعروں کی کثرت اور بعض اچھی غزلوں کے پڑھے جانے کے باعث گزشتہ مشاعروں کی نسبت بہت پُر زور رہا ۔

نظموں کا سلسلہ :

اب مشاعرۂ اتحاد میں مصرع طرح کے علاوہ کبھی کبھی اخلاق

نظموں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی عنوان دیا جانے لگا۔ اواخر ۱۸۹۸ء میں نواب غلام محبوب سبحانی کے علاوہ شیخ محمد رفیع اختر سوداگرِ اعظم بھی شریک مشاعرہ تھے۔ اس مشاعرے میں چند اصحاب نے ''جہالت'' کے عنوان پر نظمیں پڑھیں جن میں فوق صاحب کی نظم اس زمانے کے قریباً تمام اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اقبال کی مشہور نظمیں ہمالہ، دردِ عشق، موج دریا، انسان اور بزم قدرت اور بعض دوسری نظمیں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

نومبر ۱۸۹۹ء کے مشاعرۂ اتحاد میں مصرع طرح کے علاوہ نظم کے لیے ''گردشِ ایام'' کا عنوان تجویز کیا گیا تھا جو غالباً اقبال کی ایک نظم کے مطلعِ ذیل سے لیا گیا تھا:

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں
بدن میں جاں تھی کہ جیسے قفس میں صیدِ زبوں

یہ نظم انھوں نے فروری ۱۸۹۶ء میں انجمنِ کشمیری مسلمانان لاہور کی تاسیس کے موقع پر لکھی تھی اور ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

انجمن مشاعرہ کی نشاۃ ثانیہ:

اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشاعروں میں پھر کچھ تعطل سا پیدا ہو گیا اور ۱۹۰۲ء میں انھیں دوبارہ جاری کیا گیا۔ چنانچہ انجمن کی نشاۃ ثانیہ کی پہلی روئداد ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ یہ ایک اخباری رپورٹ ہے:

''آخرکار ایک عرصے کی خاموشی کے بعد لاہور کی انجمن مشاعرۂ اتحاد یا لٹریری سوسائٹی وفعتاً پھر کتمِ عدم سے

پردۂ وجود میں آ گئی - بے شک یہ نہایت نامناسب بات تھی کہ لاہور ایسے علمی شہر میں علم دوست حضرات کا کوئی بھی علمی شغل نہ ہو - منشی احمد حسین خاں صاحب بی - اے - کی ان تھک ہمت تعریف کے قابل ہے کہ وہ باوجود عدیم الفرصتی کے کم از کم اپنے شہر کے علم دوست حضرات کو خوش رکھنے کے لیے کچھ دلچسپی کے سامان مہیا کر لیتے ہیں - دفعتاً کا لفظ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ تاریخ مشاعرہ سے دو دن بھی پہلے نوٹس شائع نہیں کیا گیا اور اسی جلد بازی یا عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ صرف دو تین لڑکوں نے ہی مصرع طرح پر معمولی غزلیں پڑھیں - ہاں خود سیکریٹری صاحب یعنی منشی احمد حسین خاں کا مضمون ''تہذیبِ نسواں'' کے متعلق بہت اچھا تھا اور بہت خوبی سے ادا کیا گیا تھا - منشی حامد حسین صاحب حامد کی نظم بھی اچھی تھی - میر ممتاز علی صاحب مالک اخبار 'تہذیب نسواں' نے بھی تہذیبِ نسواں ہی پر لکچر دیا - یہ کسی قدر نامناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ مشاعرہ ہو سوسائٹی کا اور تمام وقت ایک ہی مضمون پر صرف کیا جائے - لٹریری سوسائٹی کا جلسہ تو ۱۴ جون کی شام کو تھا مگر سخت آندھی کے باعث ۱۶ جون کی شام کو ہوا - ۱۴ جون کی شام کو آندھی اور کسی قدر بارش کے باعث جلسہ نہ ہو سکا مگر حاضرین کی کثرت سے اس قدر تو معلوم ہو گیا کہ اہلِ لاہور کو علمی مجالس کی کس قدر ضرورت اور شوق

ہے اور وہ ایسے جلسوں کا کس بے چینی سے انتظار کر رہے تھے - عالی جناب نواب غلام محبوب سبحانی صاحب رئیسِ اعظم لاہور کی شمولیت جلسے کی خاص زینت تھی - میرے خیال میں اگر مشہور علم دوست پروفیسر آرنلڈ کو اس لٹریری سوسائٹی کا لائف پریذیڈنٹ قرار دیا جائے تو بہت انسب ہوگا اور کچھ عجب نہیں اگر مسٹر آرنلڈ ہی ڈاکٹر لائٹنر ثانی[1] بن کر اس لٹریری سوسائٹی کو مرحوم انجمن پنجاب سے بھی زیادہ بارونق کردیں - اگر خدا نے فرصت دی تو لاہور کی اس علمی سوسائٹی پر بہت کچھ بحث کرنے کا ارادہ ہے -"[2]

مندرجہ بالا تحریر کی آخری چند سطریں غمازی کر رہی ہیں کہ ان کے پردے میں علامہ اقبال کی روح بول رہی ہے ، ورنہ عام اردو شاعروں اور صحافیوں کو پروفیسر آرنلڈ سے اتنی عقیدت کہاں ہو سکتی تھی جتنی فلسفہ کے دلدادہ اقبال کو تھی -

اقبال کے ساتھی :

اقبال کو جب کبھی موقع ملتا ، وہ ان مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں اور نظمیں پڑھتے ، جو بے حد مقبول ہوتیں - ان کے ساتھیوں میں اس وقت مندرجہ ذیل حضرات خاص طور پر مشہور اور قابلِ ذکر تھے :

(۱) منشی محمد الدین فوق : (۱۸۷۶ع-۱۹۴۵ع) مدیر اخبار

۱- ڈاکٹر لائٹنر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے ڈائرکٹر تھے - وہ ان انگریزوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں ، جو ملکی زبان و علوم کی سرپرستی کو نظم و نسقِ سلطنت کا ایک اہم جزو سمجھتے تھے -

۲- ہفتہ وار اخبار "پنجۂ فولاد" ، لاہور ، بابت ۱۸ جون ۱۹۰۲ع -

پنجۂ فولاد و کشمیری لاہور، اقبال کے ہم وطن اور داغ کے شاگرد تھے - بہت اچھا کہتے تھے - شاعر کی بہ نسبت ایک اخبار نویس اور مورخ کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں - اقبال ان کی خدمات کشمیر سے خوش ہو کر انھیں مجددِ کشامرہ کہا کرتے تھے - ان کے کلام کے دو مجموعے 'کلام فوق' اور 'نغمہ و گلزار' چھپ چکے ہیں -

(۲) میر جالب دہلوی : سید بشارت علی نام تھا - بڑے ذہین اور طبیعت دار شخص تھے - انگریزی اور فارسی میں کافی استعداد رکھتے تھے - نہایت پختہ مغز اخبار نویس تھے اور شاعری میں داغ کے شاگرد - چند ماہ استاد کی خدمت میں حیدرآباد بھی جا کر رہے - 'پیسہ اخبار' اور 'شریف بی بی' لاہور، 'وکیل امرتسر' اور 'اودھ اخبار' لکھنو وغیرہ متعدد اخباروں کی ادارت کی مگر کسی جگہ جم کر نہیں بیٹھے - آخری عمر میں تعلقہ داران اودھ کے روزانہ اخبار 'ہمدم' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے - بعد میں اپنا اخبار 'ہمت' جاری کر لیا تھا - معلومات کے لحاظ سے چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا سمجھے جاتے تھے - ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو ساٹھ ستر برس کی عمر میں انتقال کیا - نمونۂ کلام یہ ہے :

کسی عاشق پہ جب بیداد کرنا
ہمیں بھی او ستم گر یاد کرنا
تمھیں ظالم بنایا ظلم سہ کر
نہ یہ محنت مری برباد کرنا
نیا عاشق ہو گر پیدا تو تم بھی
کوئی تازہ ستم ایجاد کرنا
مٹانا خاک پر لکھ کر مرا نام
نہ ہوں جب میں تو یوں بیداد کرنا

وارفتہ جو کسی کی کمر اور دہاں کے ہیں
ان کو خبر نہیں کہ کہاں ہیں کہاں کے ہیں
جنّت کا حال کھل گیا دورِ شراب سے
اس میکدے میں رند بھی سارے جہاں کے ہیں
ہم کچھ ملک نہیں جو مریں حور و خلد پر
اک بت پہ جان دیتے ہیں ، ہندوستاں کے ہیں
اے عندلیب تو نے کہاں سے اڑا لیے
یہ رنگ میرے نالۂ آتش فشاں کے ہیں

چھوڑ دے خود نمائیاں اتنی کہیں تم کو نظر نہ ہو جائے
اپنا مرنا بھی میں قبول کروں غیر کا تو اگر نہ ہو جائے
زلف و ابرو کجی پہ ہیں ہردم کہیں آپس میں شر نہ ہو جائے[1]

---

(۳) آغا شاعر قزلباش دہلوی : (۵ مارچ ۱۸۷۱ع–۱۶ مارچ ۱۹۴۰ع) ظفر علی بیگ نام تھا اور شاعر تخلص ۔ داغ کے شاگرد تھے ۔ خود جگت استاد ، آزادیٔ ہند کے حامی اور قلم کے مرد تھے ۔ بقول جوش ملیح آبادی "بے نظیر غزل گو ، تحت اللفظ غزل سراؤں کے بادشاہ ، دہلی کی آبرو ، وضع داری کے قطب ، دینِ انسانیت کے پیمبر اور شرافت کے اوتار تھے ۔ آغا صاحب کی زبان میں وہ شیرینی تھی جیسے لعلِ فگار ، وہ لوچ تھا جیسے شاخ گل اور وہ روانی تھی جیسے آبِ رکنا باد ـــ ان کے ادبی کارنامے ہمارے لیے باعثِ استفادہ ہی نہیں ، باعث فخر بھی ہیں ۔ ان کا شباب بازارِ مصر کی مانند تاب ناک تھا اور ان کا شیب زندانِ یوسف سے زیادہ

۱۔ خمخانۂ جاوید ، جلد دوم ، ص ۲۰۲ ۔

تاریک ۔" ان کی خوش آغاز زندگی کی بد انجامی یہ تھی کہ انھوں نے کئی برس مسلسل خون تھوک تھوک کر قرآن حکیم کا جو منظوم ترجمہ کیا ، وہ ان کی حیات میں چار پاروں سے زیادہ شائع نہ ہو سکا ۔ ان کا یہ شعر حوادثِ زمانہ اور روزگار کی سفاکی سے چوٹ کھائے ہوئے دل کا مرقع ہے :

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو
کچھ یہاں ہوتا رہا ہے کچھ وہاں ہو جائے گا

وہ نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے ۔ 'مخزن' میں ان کے مضامینِ نظم و نثر اکثر شائع ہوتے تھے ۔ کئی کتابیں تصنیف کیں ، جن میں 'قتل بے نظیر' نے بہت شہرت پائی ۔ افسانے بھی لکھے اور ڈرامے بھی ۔ آپ نے ریاست جھالا واڑ سے ایک رسالہ 'آفتاب' کے نام سے جاری کیا جو کچھ عرصہ لاہور سے بھی نکلتا رہا ۔ دیوانِ اول "تیر و نشتر" مخزن پریس نے شائع کیا تھا ۔ اپنے محسن و مربی سر بھوانی سنگھ والیِ جھالاواڑ کی فرمائش پر رباعیاتِ عمر خیام کا فصیح اور ٹکسالی اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو چھپ چکا ہے ۔ ۱۹۰۳ء ۔ ۱۹۰۴ء میں لاہور آ گئے تھے ۔ مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا رنگ جاتے تھے ۔ آپ کا یہ شعر اب تک کئی دوستوں کو زبانی یاد ہے :

جب مرے ہونٹوں سے لعل شکریں جھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے

(۴) سید حافظ علی احسن صاحب احسن مارہروی بھی ۱۹۰۳ء میں لالہ سری رام ایم ۔ اے کی مشہور تالیف 'خمخانۂ جاوید' جلد اول کی اشاعت کے سلسلے میں لاہور آ گئے تھے ۔ وہ تین چار برس یہاں رہ کر اقبال کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ۔ بلکہ انھوں

نے اپنے استاد داغ کے انتقال پر ایک ماہوار رسالہ ''فصیح الملک''
بھی ۱۹۰۵ع میں یہیں سے جاری کیا جو ۱۹۱۰ع تک لاہور کے
بعد مارہرہ اور بدایوں سے شائع ہوتا رہا۔

احسن ۱۰ نومبر ۱۸۷۶ع (۲۲ شوال ۱۲۹۳ھ) کو مارہرہ میں
پیدا ہوئے۔ ۹ برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا۔ اسی سال اپنے
والد کے ساتھ حج بیت اللہ کو گئے۔ انھوں نے سفرِ حج کے دوران
فنِ تجوید عرب ہی میں حاصل کیا۔ 'ریاضِ سخن' کے نام سے ایک
گلدستہ ۱۸۹۶ع میں مارہرہ سے جاری کیا جو دو تین سال بعد بند
ہوگیا۔ ۲۵ جون ۱۸۹۶ع کو داغ کی شاگردی اختیار کی۔ اگست
۱۸۹۸ع میں استاد کی خدمت میں حیدر آباد پہنچے۔ ان دنوں داغ
محبوب گنج والے مکان کی بالائی منزل میں مقیم تھے۔ یہاں رہ کر انھوں
نے ایک طرف تو ذوقِ سخن کی تکمیل کی اور دوسری طرف بزم
داغ میں شریک ہونے والے بزرگوں اور نامور مشاہیر کی صحبت سے
فیض اٹھایا، جس نے ان کی شخصیت میں نکھار اور مزاج میں فنکارانہ
رچاؤ پیدا کردیا۔ تین سال بعد وطن لوٹے اور پھر عمر بھر میدان
شاعری میں اپنی فکر رسا اور ذہن رسا کی جولانیاں دکھاتے رہے۔
استاد کے پاس رہ کر آپ نے ''جلوۂ داغ'' کے نام سے داغ کی
سوانح عمری لکھی۔ استاد کے انتقال کے بعد ان کا غیر مطبوعہ کلام
''یادگار داغ'' کے نام سے مرتب کرکے لاہور سے شائع کیا۔ ۱۹۳۴ع
میں اقبال کی سفارش پر علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار
ہوگئے۔[1] آخری عمر میں ''انشائے داغ'' کے نام سے استاد کے خطوط کی
ترتیب میں مشغول تھے کہ ۳۰ اگست ۱۹۴۰ع کو چند روز بیمار

۱۔ محمد عبداللہ قریشی: روح مکاتیب اقبال، ص ۵۱۹۔

رہ کر چونسٹھ برس کی عمر میں انتقال فرمایا ۔

احسن فنِ تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے تھے ۔ اپنا دیوان نہایت قابلیت سے مرتب کیا ۔ "اردو لشکر" اور "داستانِ تاریخِ اردو" بھی ان کی عمدہ تصانیف ہیں ۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

وعدہ ترا اے وعدہ شکن کیا نہیں ہوتا
ہوتا ہے مگر یوں کہ وہ گویا نہیں ہوتا
دنیائے محبت کی عجب آب و ہوا ہے
بیمار جو ہوتا ہے وہ اچھا نہیں ہوتا
کس دن وہ گلی ہوتی ہے دیوانوں سے خالی
کس روز وہاں ان کا تماشا نہیں ہوتا
کیا میرے سوا ہوتے ہیں سب آنکھ کے اندھے
کیوں میری طرح غیروں سے پردا نہیں ہوتا
اس کو خلشِ عشق کی لذت نہیں ملتی
جس دل میں کوئی خارِ تمنا نہیں ہوتا
تارے تو چمکتے ہیں فلک پر مگر احسن
روشن مری قسمت کا ستارا نہیں ہوتا

نہ صنم کدے سے یہ شاد ہے ، نہ حرم کی آب و ہوا سے خوش
وہ ہے خود پسند اک آدمی ، نہ بتوں سے خوش نہ خدا سے خوش
کبھی صلح ہو کبھی جنگ ہو ، کبھی موم ہو کبھی سنگ ہو
جو یہ ہر گھڑی ترا ڈھنگ ہو تو ہو کون ایسی ادا سے خوش
نہ کرم کرے نہ وفا کرے ، مری یاد اس کو رہا کرے
جو کبھی کبھی یہ ہوا کرے تو ہے احسن اس کی جفا سے خوش

---

(۵) پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی : کشمیری پنڈت تھے - ان کے دادا پنڈت آفتاب رائے مضطر کشمیر سے نقل ِ مکانی کر کے دہلی آ بسے تھے - وہیں ۱۸۷۶ء میں ارمان پیدا ہوئے - ۱۸۹۵ء تک مختلف مدارس میں تعلیم پائی - اسی زمانے میں داغ کی شاگردی اختیار کی - خود کہتے ہیں :

شوخیٔ مضموں کا حصہ داغ سے مجھ کو ملا
شاعری مضطر سے ہے میراث میں پائی ہوئی

۱۸۹۶ء میں سہارنپور جا کر اخبار 'ظریف' اور رسالہ 'تصویر سخن' کی ادارت کی - ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۴ء تک پٹیالہ اخبار میں ادارت کے فرائض انجام دیے - ۱۹۰۴ء میں[1] لاہور آ کر اخبار 'پنجاب سا چار'، 'راجپوت گزٹ' اور 'ہتکاری' کے ایڈیٹر ہوئے اور لاہور کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے - کلام پختہ اور مذاق شاعرانہ تھا - تاریخی ذوق بھی رکھتے تھے لیکن اس کا استعمال ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ہی ہوتا تھا - طوطیٔ ہند کہلاتے تھے - بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں زیادہ تر ناول اور تاریخی رسالے ہیں - دیوان بھی مرتب کر کے شائع کیا - آخری عمر میں سیاست کا شکار ہو کر کھٹے شاستری ہوگئے - اکتوبر ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا - رنگ ِ سخن یہ ہے :

کیا لکھوں ماجرائے غم اس فتنہ گر کو میں
دل میں ہے خط میں چیر کے رکھ دوں جگر کو میں
خود ہی پہنچ گیا ہوں وہاں بہر ِ التجا
طرز ِ ادا بتاتا ہوا نامہ بر کو میں

۱- خمخانۂ جاوید ، جلد اول ، صفحات ۲۸۲ - ۲۸۵ -

تیرِ نگاہِ یار کے دونوں شہید ہیں
اب دل کی لوں خبر کہ سنبھالوں جگر کو میں
دل میں ہزاروں آرزوؤں کے لگے ہیں ڈھیر
حسرت یہ کہہ رہی ہے کہ نکالوں کدھر کو میں
نوکِ مژہ پہ گرتا ہے ہر قطرۂ سرشک
کانٹے میں آج تول رہا ہوں گُہر کو میں
دل کی تسلیوں میں شبِ غم ہے ایک ہاتھ
اک ہاتھ سے سنبھال رہا ہوں جگر کو میں
کل بھی نہ تجھ سے ہوگا وفا وعدۂ وصال
لو آج ہی سناتا ہوں کل کی خبر کو میں

انکار رہا حشر کے وعدے سے بھی تم کو
ملنے کا کوئی روز مقرر نہیں ہوتا

پھر آئی بہارِ توبہ شکن اٹھلاتی ہوئی گلزاروں میں
پھر دشتِ وحشت الجھا ہے دامانِ قبا کے تاروں میں

---

(٦) منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت صدیقی جھنجھانوی :
یہ بھی داغ کے ارشد تلامذہ میں تھے - جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے - اپنے باپ کی طرح زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گزارا - بڑے نحیف الجثہ ، نہایت کمزور ، محض ہڈیوں کا ڈھچڑ تھے - لیکن نہایت عالی دماغ ، خوددار ، مستقل مزاج اور صاحبِ فکر بزرگ تھے - پہلے اخبار 'تہذیب نسواں' اور 'پھول' کے دفتر میں کام کرتے رہے - پھر اپنا ایک ماہوار رسالہ 'اصلاح سخن' لاہور سے جاری

کیا جو بے حد مقبول ہوا ۔ اس کے بعد ایک روزانہ اخبار 'آفتاب' کے نام سے جاری کیا ۔ برسوں روزنامہ 'زمیندار' سے وابستہ رہے ۔ روزنامہ 'سیاست' میں بھی جب تک رہے نہایت تندہی سے کام کرتے رہے ۔ نظم و نثر نہایت روانی سے لکھتے تھے ۔ 'اختلاف اللسان' کے نام سے ایک ہنگامہ خیز کتاب بھی لکھی اور اپنے کلام کا مجموعہ بھی 'نظمِ وجاہت' کے نام سے شائع کیا ، جو پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں ضبط ہوگیا ۔ آخر بیمار ہو کر وطن چلے گئے جہاں ۳ اپریل ۱۹۲۴ع کو انتقال فرمایا ۔[1] لاہور کے مشاعروں میں سرگرم حصہ لیتے تھے ۔ ایک غزل کے چند شعر بطور نمونہ حاضر ہیں ۔ یہ غزل ستمبر ۱۹۰۴ع کے کسی مشاعرے کی طرح پر کہی گئی تھی ، جو میر جالب دہلوی کی صدارت میں ہونا قرار پایا تھا مگر کسی وجہ سے ہو نہ سکا تھا :

مشتاقِ دید سدِ رہِ یار کیوں ہوئے
یہ اس کے در کے سامنے دیوار کیوں ہوئے
مانگی دعائے وصل جو میں نے اٹھا کے ہاتھ
بولا وہ بت خدا سے طلب گار کیوں ہوئے
ان کو دکھاؤں میں جگر و دل کے داغ کیا
وہ جل کے کہہ اٹھیں گے یہ گلزار کیوں ہوئے
کہتے ہیں ہم تری رگِ گردن کے ہیں قریب
وہ خود بخود گلے کا مرے ہار کیوں ہوئے
برپا قیامت اور قیامت میں ہو گئی
بن ٹھن کے حشر میں وہ نمودار کیوں ہوئے

۱۔ اخبار کشمیری لاہور ، ۱۴ اپریل ۲۴ع ۔

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مرتے ہو مجھ پہ روز
ایسے تم اپنی جان سے بیزار کیوں ہوئے
رندوں سے تو لڑا جو نہیں میکدے میں شیخ
پھر تار تار جبّہ و دستار کیوں ہوئے
الجھن یہ رات دن کی وجاہت وبال ہے
تم مبتلائے گیسو و رخسار کیوں ہوئے

(۷) سید غلام بھیک نیرنگ بھی اس دور کی ایک نمایاں شخصیت اور داغ کے شاگرد تھے - اس رشتے سے اقبال کو بہت عزیز تھے - وہ دورانہ ضلع انبالہ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے - میٹرک پاس کرنے کے بعد بی - اے اور ایل - ایل - بی کی تعلیم گورنمنٹ کالج اور لاء کالج لاہور سے حاصل کی - یہیں اقبال سے ملاقات ہوئی - ذوق و مشرب کی یگانگت کے باعث دونوں کی طبیعتیں مل گئیں اور وہ اقبال کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہونے لگے - اس وقت لاہور کی کوئی ادبی یا قومی تحریک ایسی نہ تھی جس میں انھوں نے اپنی ہمہ گیر طبیعت کے ساتھ حصہ نہ لیا ہو - وہ بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے - غزل ، نظم ، مضمون یا تقریر ہر شے پر قادر تھے - انھوں نے اپنے اندر ملت کے اتنے دکھ سمیٹ لیے تھے کہ ان کے وجود کو ملی جد و جہد کے حوالے کے بغیر دیکھا ہی نہیں جا سکتا - ''کلامِ نیرنگ'' اور ''غبار آفق'' دو کتابیں ان کی شاعری کی یادگار ہیں - ان کا شمار دبستان پنجاب کے اس گروہ میں ہوتا ہے جس نے شاعری میں زندگی کے مسائل داخل کیے - اردو شاعری کو جدید رجحانات سے روشناس کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے - آخری عمر میں شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر بالکل قومی کاموں کے لیے وقف ہو گئے تھے - قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے تھے -

یہیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ع کی رات کو انتقال کیا ۔ رنگ سخن یہ تھا :

اک ہجومِ غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے
جائے ماندن ہمیں حاصل ہے ، نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے خدا خیر کرے
آ چلا اس بت عیار کی باتوں کا یقین
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے
دل گیا ، جانے دو ، کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی مروّت ہے خدا خیر کرے
ابھی تشخیصِ مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جاں ادھر درپۓ رخصت ہے خدا خیر کرے
رہ نماؤں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
راہ رو پیکرِ حیرت ہے خدا خیر کرے

یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا
ترے جور سہہ کر بھی مسرور رہنا
غضب ہے رقیبوں سے لگ لگ کے چلنا
مگر ہم غریبوں سے یوں دور رہنا
بقا بعدِ مردن اگر ہے تو یہ ہے
ہمیشہ زمانے میں مشہور رہنا
وہ قسمیں کہ ان سے ملیں گے نہ ہرگز
مگر دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

ستم ہے ہمارے ہی دل میں سمانا
ہماری ہی آنکھوں سے مستور رہنا
تری مست آنکھوں سے سیکھا ہے میں نے
شرابِ تخیّل سے مخمور رہنا
جلانے کو لایا ہوں میں رختِ ہستی
خبردار ! او شعلۂ طور رہنا
بنا دے اسے غیرتِ قصرِ جنّت
مرے دل میں اے غیرتِ حُور رہنا
جو ان سے ملو گے تو جھینکو گے نیرنگ
بُتوں سے ذرا دور ہی دور رہنا

اسی زمین اور ردیف و قافیہ میں اقبال کی بھی ایک غزل ملتی ہے ، مگر وہ انھوں نے اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کی - 'باقیاتِ اقبال' میں دیکھی جا سکتی ہے -

(۸) تارا چند تارا : یہ منشی الٰہی بخش رفیق کے شاگردوں میں ایک اچھے شاعر تھے - دہلی دروازے کے اندر سوہن حلوہ بیچا کرتے تھے - ان کا یہ مصرع اس بات کا مظہر ہے :ع

تارا نہ ہو تو حلوائے سوہن کھلائے کون

فصیح الملک نواب مرزا خان داغ دہلوی جب ایک دفعہ لاہور آئے تھے تو تارا کی دکان پر بھی گئے تھے - مولانا حالی ، مولانا آزاد اور علامہ اقبال سے بھی ان کے مراسم بہت اچھے تھے - اقبال جب تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت گئے تو اپنے خطوں میں تارا کو بھی یاد کرتے رہے - ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں ان کا انتقال ہوا - عمر اسّی سال کے قریب تھی اور صحت بہت اچھی تھی -

اس زمانے کے حالات آج کے زمانے سے بالکل مختلف تھے - ہندو

مسلمانوں کے اور مسلمان ہندوؤں کے بزرگوں کا ادب و احترام کرتے تھے ۔ بعض دفعہ مشاعروں میں عاشقانہ مصرع طرح کی بجائے نعتیہ مصرع طبع آزمائی کے لیے دیا جاتا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو شعرا بھی بڑے شوق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں قصیدے اور نعتیں لکھ کر لاتے تھے ۔ تارا چند نے بھی ایسے مشاعروں کے لیے نعتیں کہی ہیں ۔ ان کے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

ہیں جہاں میں گو بظاہر مائلِ زنّار ہم
دل سے ہیں مفتونِ حسنِ احمدِ مختار ہم
اس تمنا میں درِ دیدہ سدا رہتے ہیں وا
شاہدِ مقصود کا دیکھیں کہیں دیدار ہم
گر مدینہ کی طرف جائے تو لکھ بھیجیں وہاں
دامنِ بادِ صبا پر اپنا حال زار ہم

یوں انبیا ہیں میرے پیمبر کے سامنے
جیسے چکور ہوں مہِ انور کے سامنے
پرواز مرغ روح کرے میری یا خدا
جا کر نبیؐ کے روضۂ اطہر کے سامنے
تارا غزل نہ ہر کس و ناکس کو تو دکھا
لے چل مگر رفیقِ سخنور کے سامنے

جو رکھتا دل میں اپنے نورِ عشق مصطفیٰ ہوگا
تو قندیلِ فلک کی طرح سینہ پُر ضیا ہوگا

نہاں اسرار عشق مصطفیٰ کب تک ہو سینے میں
یہ افسانہ ضرور اک دن جہاں میں برملا ہوگا
لوائے حمد کا پنجہ جو چمکے گا قیامت میں
اسی کے نور سے تارا کا بھی تارا چڑھا ہوگا

نہیں تھا جز خدا کچھ پہلے اے تارا محمدؐ سے
ہوا ہے انتظامِ دو جہاں سارا محمدؐ سے
وجودِ عالمِ امکاں بنا سارا محمدؐ سے
بنا ہے دونوں عالم کی یہ اے تارا محمدؐ سے
تعلق حرصِ دنیاوی کا یا رب دور ہو جائے
نہیں یہ ملنے دیتا نفسِ امّارہ محمدؐ سے

تارا نے اپنے کلام کے ساتھ اپنے استاد رفیق کا کلام بھی چھپوایا تھا مگر اب نایاب ہے - یہ ہندو مسلم تعلقات اور رواداری کی ایک بے نظیر مثال ہے -

(۹) ابو الاعجاز منشی عبدالمجید ازل لاہور کے ایک شریف راعی خاندان کے چشم و چراغ تھے - بچپن ہی سے شعر کہتے تھے - ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی ، جس سے سلاست زبان اور صفائی بیان کی خوبی آپ کے کلام میں پیدا ہوگئی - آپ کی غزلیں جو عام طور پر استاد کے رنگ میں رنگی ہوتی تھیں ، لاہور کے مشاعروں میں خوب سرسبز ہوتی تھیں - نمونے کے طور پر ان کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

اس نے مژگاں کا تان کر بھالا اپنے عاشق کو مار ہی ڈالا
عشق گیسو کو دی جگہ دل میں سانپ کو آستین میں پالا
تیری زلفوں کا تیری آنکھوں کا کوئی وحشی ہے ، کوئی متوالا

اک نیا ظلم روز کرتا ہے کس ستم گر سے پڑ گیا پالا
بے نوائی میں خوش ہوں اپنی ازل
نے غمِ دزد، نے غمِ کالا

دیکھ کر خلقت اسے حیران ہے
وہ حسیں کیا ہے خدا کی شان ہے
ہم تری نظروں میں کچھ ہوں یا نہ ہوں
تو ہماری جان ہے ایمان ہے
ہر طرح کا رنج سہنے کے لیے
اس جہاں میں کون ہے انسان ہے
پورا کرنے کی نہ ہو نیّت اگر
وعدہ کر لینا بہت آسان ہے
ہم ترے ہوتے فدا ہوں غیر پر
''افترا ہے جھوٹ ہے بہتان ہے"

کسی سے بھی نہیں ملتا ہر اک سے دور رہتا ہے
خدا جانے وہ کس دھن میں بتِ مغرور رہتا ہے
خدارا آپ رہنے دیں مرا سر اپنے زانو پر
وہاں رہتا ہے جب تک دردِ سر کافور رہتا ہے

تھک گئے ہجر میں رو کر تو کیا ضبط ازل
رو لیا بیٹھ کے جب ضبط کا یارا نہ ہوا

آخری عمر میں آپ نے غزل کہنی چھوڑ دی تھی - صرف قومی اور اخلاقی نظمیں لکھتے تھے - ۱۹۵۰ء میں مجموعۂ کلام

ترتیب دیا ہوا میں نے خود دیکھا تھا ۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ زندہ رہے مگر دیوان چھپوا نہ سکے ۔

(۱۰) پیر وزیر علی شاہ حامی : یہ بھی داغ کے شاگرد تھے اور لاہور میں رہتے تھے ۔ ہمارے عہد کے مشہور علم دوست بزرگ پیر غلام دستگیر نامی مرحوم انھی کے چھوٹے بھائی تھے ۔ حامی غزلیں ، نظمیں ، قصیدے ، مرثیے ، قطعے اور رباعیاں سبھی کچھ کہتے تھے مگر آخری عمر میں نعت گوئی کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا تھا ۔ آپ نے دو دیوان ، ایک غزلوں کا اور دوسرا نعتیہ اپنی یادگار چھوڑے ہیں ۔ نعتیہ دیوان چھپ چکا ہے مگر غزلوں کا دیوان غیر مطبوعہ ہے ۔ وسط ۱۹۳۰ع میں بعمر ساڑھے ترپن سال فوت ہوئے ۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :

نہ تم چھوڑو کہیں ہم کو ، نہ ہم چھوڑیں کہیں تم کو
جہاں تم ہو وہیں ہم ہوں جہاں ہم ہوں وہیں تم ہو
کبھی شوقِ ملاقاتِ خدا میں عرش پر جانا
کبھی تسکینِ امت کے لیے کعبہ نشیں تم ہو
اکیلا میں رہوں کیونکر اکیلا رہ نہیں سکتا
تصور سے مرے جب خانۂ دل میں مکیں تم ہو
یہی حسرت یہی خواہش یہی ارمان ہے مجھ کو
مری آنکھوں کے آگے ہو مرے دل کے قریں تم ہو
تمھارے ہوتے کیوں حامی رہے محتاج اوروں کا
تمھی ہو بس تمھی ہو مالکِ چرخ و زمیں تم ہو

ایک ہے اپنا خدا اپنا نبی اپنی کتاب
واہ کیا تعلیم ہے وحدت نما اسلام کی

راستی پر صدق پر انصاف پر احسان پر
بانیٔ اسلام نے رکھی بنا اسلام کی

ستم کر ، ظلم کر ، جور و جفا کر
میں ہوں راضی ، جو ہو تیری رضا کر
اگر کچھ ہے مسیحائی کا دعویٰ
تو میرے دردِ دل کی بھی دوا کر
خیال یار بھی پردہ نشیں ہے
کہ چھپ جاتا ہے اپنے دل میں آ کر
دلِ عشاق پر گرتی ہے بجلی
وہ جب کرتے ہیں باتیں مسکرا کر

(۱۱) میر نثار علی شہرت دہلی کے رہنے والے تھے اور حکیم مولا بخش قلق کے شاگرد تھے - 'کوہ نور' لاہور کے علاوہ 'اخبار انجمن پنجاب'، 'پنجاب پنچ' اور 'خیرخواہ عالم' دہلی وغیرہ کے بھی ایڈیٹر رہے - محکمۂ تعلیم ریاست جموں و کشمیر کے افسر بھی رہے اور جے پور اور میرٹھ میں بھی ملازمت کی - لاہور میں کئی سال تک مضمون نگاری کرتے رہے - ۲۸ - ۱۹۲۷ع کے قریب یہیں فوت ہوئے - نمونۂ کلام دیکھیے :

یہ جنّت ایک پائیں باغ ہے اس گل کے ایواں کا
جہنم اک شرارہ ہے ہمارے داغِ سوزاں کا
فنا ہوتے ہی پہنچا ایک منزل اس سے بھی آگے
پتا کوئی بتاتا ہی نہ تھا عمرِ گریزاں کا

یہ غزل میر نثار علی شہرت نے لاہور کے اس مشاعرے میں پڑھی تھی جس میں اقبال بھی شریک تھے اور انھوں نے بھی اسی طرح

پر غزل کہی تھی : ع

"مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا"

(۱۲) بابو بہاری لال شفق بھی لاہور کی ادبی مجالس میں وقت کی چیز سمجھے جاتے تھے - وہ قابلِ قدر شاعر اور بے مثال مصنف تھے - کتاب ابھی پریس میں ہوتی تھی کہ فرمائشیں شروع ہو جاتی تھیں - ان کا ناول "دمینتی" درد انگیز ہونے کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا - خوش خلق ، ملنسار اور شیریں گفتار تھے - ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۳ع کو تیر قضا کا نشانہ ہوئے - ان کی یاد ایک عرصے تک دوستوں اور ملنے والوں کو ستاتی اور خون کے آنسو رلاتی رہی - مشاعروں میں بھی ان کی کمی محسوس کی جاتی رہی -

منشی منور خاں ساغر اکبر آبادی ، لالہ موہن لال مطلب ، خواجہ دل محمد دل ، رافت بھوپالی (مولوی عبدالرؤف خاں سب ایڈیٹر پیسہ اخبار) ، رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی اور ان جیسے دوسرے باکمال بزرگوں کی موجودگی سے بھی اس وقت لاہور غیرتِ دہلی و لکھنؤ بنا ہوا تھا بلکہ بعض لحاظ سے ان پر بھی سبقت لے گیا تھا -

مشاعروں کا خاتمہ :

پھر کچھ ایسی ہو چلی کہ گلشن تاراج ہو گیا - کچھ پھول ٹہنیوں سے ٹوٹ کر دور جا پڑے ، کچھ یوں ہی کملا کر خاک میں مل گئے - ۱۹۰۳ع میں خان احمد حسین خاں منصف ہو کر جہلم چلے گئے - نواب غلام محبوب سبحانی سرکاری مہمان کی حیثیت سے دہلی دربار میں شرکت کی غرض سے گئے تھے کہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ع کو جمعے کے روز بعارضۂ بخار انتقال فرما گئے اور آپ کی نعش دہلی

سے لاہور لا کر احاطۂ مزار داتا گنج بخشؒ میں دفن کی گئی ۔[1] مرزا ارشد گورگانی ۱۹۰۵ع میں اپنے بیٹے کے پاس ملتان گئے تھے کہ وہیں فوت ہو گئے ۔ کئی دوسرے شاعر بھی یکے بعد دیگرے اس دنیا سے اٹھ گئے ۔ ۱۹۰۵ع میں اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان تشریف لے گئے ۔ اتحاد ٹوٹ گیا ۔ شیرازہ منتشر ہو گیا اور مشاعروں کا سلسلہ بند ہو گیا ۔

چونکہ مشاعرۂ اتحاد اور مشاعرۂ قیصری ایک دوسرے کی ضد کی وجہ سے قائم تھے ، اس لیے جب ایک نہ رہا تو دوسرے کا وجود بھی بیکار سمجھا گیا ۔ میر ناظر حسین نے اپنا ہفتہ وار اخبار ناظم الہند پھر جاری کر لیا اور وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے ۔ اس طرح قیصر کی قیصریت خود بخود ختم ہو گئی ۔

اس پت جھڑ کے زمانے میں منشی محمد الدین فوق مرحوم نے ''بہارِ گلشن'' کے نام سے غزلوں کے چند گلدستے شائع کیے ، جن میں کئی دوسرے دوستوں کے ساتھ اقبال کی اکثر غزلیں بھی ان کی اجازت سے شامل کیں اور ان کے مختصر سے حالات بھی لکھے ۔ جلد دوم کا ایک رسالہ میری نظر سے گزرا ہے ، جس میں اقبال کی چار غزلیں شامل ہیں ۔ ان میں سے ایک غزل کے چند شعروں کے سوا کوئی بھی علامہ کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے ۔ یہ ابتدائی غزلیں دراصل کوئی خاص اہمیت بھی نہیں رکھتیں البتہ اقبال کے درخشاں مستقبل کا پتا ضرور دیتی ہیں ۔ ان غزلوں کے مطلعے اور مقطعے ذیل میں درج ہیں ۔ پوری غزلیں ''باقیاتِ اقبال'' میں دیکھی جا سکتی ہیں :

۱۔ اخبار ''پنجۂ فولا'' ، لاہور ، ۱۴ جنوری ۱۹۰۳ع ۔

(۱) تم آزماؤ ''ہاں'' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے
اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اسی غزل کا یہ شعر اقبال کی شہرت کا باعث بنا تھا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

---

(۲) تم نے آغاز محبت میں یہ سوچا ہوگا
کس طرح کا یہ ترا چاہنے والا ہوگا
تیرے اشعار میں اقبال یہ رنگت تو نہ تھی
تو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا

---

(۳) نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
کوئی سحر تھا ، تیری گفتار کیا تھی

''بانگِ درا'' میں اس غزل کے صرف چھ شعر شامل ہیں حالانکہ ''بہارِ گلشن'' میں اس کے سترہ شعر ہیں :

(۴) عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا
وہ سو ناز اقبال پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے ان کو مشہور اپنا

جدید مشاعرہ :

جب بھاٹی دروازے کے اندر مشاعروں کا سلسلہ بند ہو گیا تو لاہور کے اہلِ سخن اور علم دوست حضرات کو ایک جدید مشاعرے کی ضرورت محسوس ہوئی - میر بشارت علی صاحب جالب دہلوی ، جو آن دنوں ''پیسہ اخبار'' کے ایڈیٹر تھے ، دہلی دروازے کے اندر ایک احاطے میں رہا کرتے تھے - ان کے مشورے سے ایک جدید مشاعرے کی طرح ڈالی گئی - پہلے مشاعرے کے لیے یہ طرح دی گئی :

یہ کہیے آپ میرے طلب گار کیوں ہوئے

لیکن افسوس کہ اس مشاعرے کا سلسلہ بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا -

مشاعرۂ چمنِ سخن :

۱۹۰۳ع میں لالہ بشن سہائے آزاد نے اپنے تخلص کی رعایت سے ''آزاد'' نام کا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں نظم کا کافی حصہ ہوتا تھا - رسالے کو رونق اور ترقی دینے کے لیے انھوں نے چمنِ سخن کے نام سے ایک مشاعرے کا سلسلہ بھی شروع کیا ، جس کے چند جلسے ایچیسن اسکول بیرون موری دروازہ لاہور کے وسیع صحن میں ہوئے - جنوری ۱۹۰۳ع کے آخری ہفتے کی شام کو اس طرح پر مشاعرہ ختم ہوا :

''اترا ہوا گلے سے ترے ہار کیا ہوا''

مشاعرۂ بھارت سبھا :

اب سے قریباً پون صدی پیشتر (۱۹۰۶ع و ۱۹۰۷ع میں) لاہور میں ''بھارت ماتا'' کے نام سے ایک سیاسی انجمن قائم تھی ، جس کی سرپرستی میں ایک ماہنامہ بھی شائع ہوتا تھا - صوفی

انبا پرشاد ، سردار اجیت سنگھ ، لالہ ایشری پرشاد (نیم سوپ والے جنھوں نے نیم کا صابن بنا کر بڑی شہرت حاصل کی تھی) ، منشی منور خاں ساغر اکبر آبادی ، لالہ پنڈی داس ایڈیٹر اخبار ''انڈیا'' گوجرانوالہ ، لالہ لال چند فلک ، لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی ایڈیٹر اخبار ''ہندوستان'' اور مہتہ نند کشور وغیرہ کئی اصحاب اس سبھا اور رسالے کے کارکن اور معاون تھے ۔ اس سبھا کے جلسوں میں بڑی تیز و تند تقریریں کی جاتیں اور سیاسی نظمیں پڑھی جاتی تھیں ۔ لالہ لال چند فلک کی ایک نظم کا یہ مصرع آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے :

ع   تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا

بعض احباب کے اصرار سے منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور نے ۵ مارچ ۱۹۰۷ع کو ایک نظم ''ہم اور ہمارا حال'' پڑھی ، جس کے متعلق صوفی انبا پرشاد اور سردار اجیت سنگھ کا خیال تھا کہ یہ معتدل پالیسی کا اظہار ہے ۔ ہم انتہا پسند ہیں ۔ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہونی چاہیے ۔ مگر اس کے فوراً بعد لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ گرفتار کرکے مانڈلے (برما) میں جلا وطن کر دیے گئے اور ملک میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ لالہ پنڈی داس اور لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی بھی گرفتار کر لیے گئے ۔ بھارت سبھا بند ، رسالہ درہم برہم اور ان کے کارکن سب تتر بتر ہوگئے ۔ یہاں تک کہ کوئی بھارت ماتا کا نام لینے والا نہ رہا اور پنجاب کے مطلعِ سیاست پر خوف و ہراس کے بادل چھا گئے ۔

آج (۱۹۸۱ع میں) اس واقعے کو چوہتر برس گزر چکے ہیں ۔ اس طویل عرصے میں بہت سے انقلاب آئے ۔ ملک نے کئی آلٹ پھیر دیکھے ۔ خود فوق صاحب بھی اس دنیا سے چل بسے مگر ان کی

کہی ہوئی نظم ابھی تک موجود ہے اور آج بھی ویسی ہی ترو تازہ ہے جیسی آج سے چوہتر برس پیشتر تھی ۔ اقبال اُن دنوں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے ہوئے تھے مگر ان کا قومی ترانہ سارے ملک میں گونج رہا تھا ۔ فوق صاحب کی نظم کے پہلے شعر میں اقبال کی طرف اور آخری بند میں اقبال کے ترانے کی طرف اشارہ ہے ۔ چند شعر یہ ہیں :

غیروں کے ملک میں اب اقبال ہے ہمارا
اُمید کا خزانہ پامال ہے ہمارا
ہم ہند میں رہیں یا باہر کمانے جائیں
اللہ جانتا ہے جو حال ہے ہمارا
اک زخم ہو تو سی لیں اک رنج ہو تو سہہ لیں
دل تیر ہائے غم سے غربال ہے ہمارا
اک رہ گئی تھی دولت سو وہ بھی چل بسی ہے
افلاس اور فاقہ اب مال ہے ہمارا

اے داستانِ پُر غم ایسا اثر دکھا دے
ہندوستان والوں کو خواب سے جگا دے

حبِ وطن ہو جس میں اس دل کو ڈھونڈتے ہیں
کشتِ اُمید سے ہم حاصل کو ڈھونڈتے ہیں
ہے دستِ سعی کوتہ ، کاخِ بلند ارفع
ٹوٹے ہیں پائے کوشش منزل کو ڈھونڈتے ہیں
گردابِ زندگی سے اب جاں بری ہے مشکل
چکر میں آ گئے ہیں ، ساحل کو ڈھونڈتے ہیں
ضبطِ فغاں ہو کیونکر چلتی نہیں ہماری
اے وائے ہم ہیں ناقص ، کامل کو ڈھونڈتے ہیں

دل می‌رود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

خوش ہو کے کہہ رہا ہے ہر نوجواں ہمارا
''ہندوستاں ہمارا ، ہندوستاں ہمارا''
پھر کیوں طبیب سے ہم اپنا مرض چھپائیں
چہرے سے جب عیاں ہے دردِ نہاں ہمارا
کیونکر نہ شور سے ہم سر پر فلک اٹھائیں
اس آسماں کے اوپر ہے آسماں ہمارا
اے بےکسوں کے والی تو دستگیر ہو جا
دلدل میں پھنس گیا ہے اب کارواں ہمارا
اے فوق حال دل ہم کس کو سنانے جائیں
سنتا نہیں ہے کوئی دردِ نہاں ہمارا

انجمن سخن کے مشاعرے :

۱۹۰۸ع میں مشاعروں کا مرکز بھاٹی دروازے کی بجائے دہلی دروازہ بن گیا ۔ چنانچہ ''انجمنِ سخن'' کے نام سے ہر مہینے کے آخری ہفتے کو جو مشاعرے دفتر صدائے ہند میں ہوا کرتے تھے ، ان میں فوق اور وجاہت جھنجھانوی کا زیادہ عمل دخل ہوتا تھا ۔ میر بشارت علی جالب دہلوی ، میر نثار علی شہرت دہلوی ، منشی منور خاں ساغر اکبر آبادی ، گوہر دہلوی ، تارا چند تارا ، للتا پرشاد شاد میرٹھی ، مولانا تاجور نجیب آبادی ، حکیم اللہ یار جوگی ، پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی ، میاں عبدالمجید ازل ، منشی دین محمد مالک اخبار صدائے ہند (بعد میں میونسپل گزٹ) اور خواجہ دل محمد ایم ۔ اے ۔ وغیرہ اس انجمن کی رونق کا باعث ہوتے تھے ۔ اس میں طرحی اور

غیر طرحی غزلیں اور کسی خاص عنوان پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں - اقبال بھی ولایت سے واپس آنے کے بعد کبھی کبھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے -

ان مشاعروں کا ذکر کلامِ فوق میں جابجا موجود ہے - یہ مشاعرے اتنے مشہور و مقبول ہوئے کہ ان کی شہرت ہندوستان سے نکل کر بخارا تک پہنچی - جون ۱۹۰۹ع کے مخزن میں ایک نظم ''اردو علم ادب'' کے عنوان کے چھپی جس میں اردو کی ہردلعزیزی اور شعرائے دہلی و لکھنؤ کے تذکرے کے بعد لاہور کے ان شعرا کا بھی ذکر کیا گیا ہے ، جو اس انجمنِ سخن کی روح و رواں بن کر اردو کی خدمت کر رہے تھے - یہ نظم سید احمد حسین صاحب شوق نے لکھی تھی جو لاہور کے گیلانی سادات میں سے تھے اور ان دنوں بخارا میں مقیم تھے - یہ انھوں نے خاص اس مشاعرے کے لیے بھیجی تھی جو اپریل ۱۹۰۹ع کے آخری ہفتے میں ہوا تھا - چند شعر ملاحظہ ہوں :

آج اے اردو ! ستارہ ہے ترا چمکا ہوا
وہ ضیاء ہے ، ہند سب آئینہٴ سیما ہوا
اس قدر تیری ترقی کا نہ تھا ہم کو گماں
تو نے وہ دکھلا دیا جس کا نہ تھا کچھ بھی نشاں
چاہنے والوں کا تیرے ہے جو حلقہ بے شمار
ان میں شاعر ایک اک ہے انتخابِ روزگار

ولی دکنی سے لے کر داغ ، امیر اور حالی کے ذکر کے بعد :

فوق بھی ہیں نظم کو تیری جگانے کے لیے
انجمن قائم ہوئی تجھ کو بڑھانے کے لیے

کیوں معرف ہو نہ ہر باشندۂ ہندوستاں
ناز مخزن پر ہے کرتی آج یہ اردو زباں
ہر مقالہ دلکش و دلچسپ ہے رنگیں یہاں
کیا ایڈیٹر کا ہوا ہے اوج پر نام و نشاں
دوستوں میں حضرت خاتم کے وہ خوش کام ہے
رہتے ہیں دلی میں ، عبدالقادر ان کا نام ہے
لطف جو پائے ہیں تجھ میں پہلے وہ آئے نہیں
شاعرانِ باکمال ایسے نظر آئے نہیں
شوق گیلانی بھی ان تیرے ثناخوانوں میں ہے
حال جس کا آج کل غربت کے افسانوں میں ہے[1]

بزمِ اُردو :

انھی دنوں لاہور میں ایک اور ادبی انجمن بزمِ اردو کے نام سے قائم ہوئی ، جس کے سیکریٹری غالباً خان بشیر حسین خاں تھے - اس کے ایک اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی تھی - یہ اجلاس ۲۳ اپریل ۱۹۱۱ء کو مولوی سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی کی تعزیت کے لیے منعقد کیا گیا تھا - مولانا ظہیر دہلوی کا انتقال ۱۹ مارچ کو حیدرآباد دکن میں ہوا - وہ حضرت ذوق مرحوم کے شاگرد اور مرزا داغ دہلوی کے استاد بھائی تھے - اس لیے وہ حضرت علامہ اور استاد داغ کے دوسرے شاگردوں کے نزدیک بے حد واجب التعظیم بزرگ تھے - بقول مولانا ظفر علی خاں "میر سے لے کر غالب و ذوق تک کی شاعری کے تمام اوصاف ان میں جمع تھے - وہ اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کی تاریخ تھے - پرانی شاعری کی سب

۱- مخزن ، جون ۱۹۰۹ء ، ص ۶۱ - ۶۳ -

رونق ان کے کلام میں موجود تھی - وہ قصیدہ اور غزل کے استاد تھے -''
میر جالب دہلوی کے نزدیک ''ظہیر دہلوی محاورہ بندی ، پر گوئی اور سادگی میں ذوق تھے - نازک خیالی میں مومن اور مشکل گوئی میں غالب -''

اس جلسے میں مولانا ظفر علی خاں اور میر جالب دہلوی نے تقریریں کیں اور منشی محمد الدین فوق ، منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی ، خواجہ دل محمد ایم - اے اور منشی ہدایت اللہ شیدا امرتسری نے نظمیں پڑھیں - علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا :

''میں گزشتہ سال حیدر آباد دکن گیا تو وہاں کے اہل ِ کمال سے ملا - چنانچہ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل (مانکپوری ، جانشین امیر مینائی) کے ہاں میری دعوت ہوئی - وہیں مولانا ظہیر بھی تشریف رکھتے تھے - مولانا نے مجھ سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی ، مگر سنانے سے زیادہ مجھے خود یہ شوق تھا کہ میں مولانا کی زبان سے کوئی شعر سنوں - چنانچہ میں نے عرض کیا - حضرت ! جب تک میں پہلے آپ کی زبان سے شعر نہ سن لوں گا ، اپنا شعر ہرگز نہ سناؤں گا - مولانا نے اس درخواست کو منظور فرمایا اور یہ شعر سنایا :

وہ جھوٹا عشق ہے جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو

ایک آدھ شعر اور بھی سنایا تھا مگر وہ یاد نہیں رہا - مولانا ظہیر اس وقت بہت ضعیف و ناتواں تھے - اونچا سنتے تھے اور ان کی ہستی تبرک تھی -''

حضرت علامہ نے جلسے میں بیٹھے بیٹھے "زبدۂ عالم ظہیر دہلوی" سے مولانا ظہیر کی تاریخِ وفات (۱۳۲۹ھ) بھی نکالی تھی مگر وہ اس کو نظم نہ کر سکے۔

حشر کی آمد:

آغا حشر کاشمیری جب لاہور میں پہلی بار آئے تو اس بزم ادب نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ مجلس منعقد کی۔ علامہ اقبال اس میں صدر کی حیثیت سے شریک تھے۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ تمام ارباب شعر و ادب موجود تھے۔ مقررہ وقت پر حاضرین نے شور مچایا کہ "آغا حشر کو بلاؤ" مگر آغا صاحب کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ منتظمین کی معذرت کے باوجود مجمع میں زیادہ اضطراب و انتشار پیدا ہونے لگا۔ آخر کچھ دیر کے بعد آغا صاحب تشریف لے آئے۔ وہ حسبِ معمول اپنی مخصوص وضع میں ریشمی کرتہ اور مشہدی تہبند پہنے ہوئے تھے۔ اکثر لوگوں نے ان کی غیرمعمولی شہرت اور فنی کمالات کے چرچے سن کر جس شخصیت کا تصور کیا ہوا تھا، آغا صاحب اس کے بالکل برعکس تھے۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ چند سامعین نے آوازے کسے۔ صدر جلسہ نے تعارف کرایا اور آغا صاحب نے اسٹیج پر آ کر تقریر شروع کردی، لیکن حاضرین اس حشر کو سننے کے لیے تیار نہ ہوئے بلکہ تالیاں بجا بجا کر شور مچانے لگے۔ اس پر علامہ اقبال نے ڈائس پر آ کر فی البدیہ یہ شعر پڑھا:

شور ایسا ہے کہ قصابوں کی ہو جیسے برات
آئیے لاہور کی یہ بزمِ ماتم دیکھیے[1]

۱۔ باقیات اقبال، ص ۴۵۲۔

اس بزم کی خدمتِ اُردو کا اثر یہ ہوا کہ ۱۲ جنوری ۱۹۱۲ء کے روز نامہ زمیندار لاہور میں ایک نظم بعنوان "اُردو" شائع ہوئی جس میں اس دور کی ادبی سرگرمیوں پر بہترین تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ نظم جناب زوار الہ آبادی مقیم برہانپور کی لکھی ہوئی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

جو میں دکھانے پہ آؤں لطافتِ اُردو
جبینِ حور پہ لکھ دوں عبارتِ اُردو
تمام ہند میں جاری ہے اس زبان کا فیض
ہر اک بشر پہ ہے لطف و عنایتِ اُردو
جو قوم ملک میں کرتی ہے حکم رانی آج
ہے اس کے دل میں بھی شوقِ حمایتِ اُردو
اور ایک تم ہو کہ نفرت ہے اپنی بولی سے
پسند ہی نہیں آتی حلاوتِ اُردو
خدا کا شکر ہے واجب کہ ان دنوں لاہور
بنا ہے حامیٔ اقبال و رایتِ اُردو
ظفر[1] کی دھوم ہے، اقبال[2] و فوق[3] کا چرچا
ہے جن کی ذات سے باقی وجاہتِ[4] اُردو
رہے یہ مجمعِ احباب مدتوں قائم
انھیں ہو سعد الٰہی وکالتِ اُردو

۱۔ مولانا ظفر علی خاں۔
۲۔ علامہ اقبال۔
۳۔ منشی محمد الدین فوق۔
۴۔ وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی۔

کتاب حشر[1] میں یا رب ہوں جس قدر اوراق
بڑھا دے فضل سے اپنے ضخامتِ اردو

تبصرہ :

اس دور میں اقبال کی غزلیں عام طور پر سادہ ہوتی تھیں اور سادگی ہی ان کا جوہر تھا ، جو اس وقت داغ کے شاگردوں کا خاص رنگ تھا ۔ ان میں مضمون آفرینی بھی ہوتی تھی اور بعض بعض شعر بڑے شوخ اور گرم بھی نکل آتے تھے ، جو درد اور سوزِ عشق میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے ۔ مگر بعد میں اقبال نے روایتی غزل کی عام روش ترک کرکے اپنے لیے نئی شاہراہ اختیار کر لی جو ان کی طبیعت اور مزاج کے عین مطابق تھی ۔ اسی لیے اقبال نے ''بانگِ درا'' کی ترتیب کے وقت پرانے رنگ کی تمام غزلیں نہایت بے دردی سے ضائع کردیں اور صرف وہی کلام رہنے دیا جو زندگی افروز تھا اور زندہ رہنے کے قابل ۔

دراصل اقبال شروع ہی سے دلِ گداختہ لے کر آئے تھے ۔ ان کی سرشت میں سوز و گداز کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ ذہنی تجسّس نے انھیں حقیقت کی تلاش میں مبتلا کر رکھا تھا اور اس کا اظہار بھی اکثر ہوتا رہتا تھا ۔ ان کے نزدیک کلام میں غم کا عنصر شامل ہونا مشرق شاعری کی ایک خاص صفت تھی ۔ فرماتے ہیں :

پیرِ مغاں ! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ ''کیف غم'' نہیں ، مجھ کو تو خانہ ساز دے

۱۔ آغا حشر کاشمیری کی طرف اشارہ ہے جو اس بزمِ اُردو میں شریک ہو کر اپنا کلام سناتے تھے ۔

ان کا نظریہ ان مصرعوں سے بھی اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے :

ع عبادت چشم شاعر کی ہے ہردم باوضو رہنا

اور

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق

سوز و گداز کی اس کیفیت کے ساتھ اقبال کو موسیقی سے بھی خاص رغبت تھی ۔ انھیں اس فن کی باریکیوں سے گہری واقفیت حاصل کرنے کا تو موقع نہیں ملا مگر قدرت نے انھیں گلا اچھا عطا کیا تھا ۔ وہ قرآن مجید نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے ۔ ان کی آواز بلند اور پُرتاثیر تھی ، اس لیے کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کی محفل میں اپنا کلام بھی ترنم سے پڑھتے تھے ، جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا ۔ بقول سر عبدالقادر وہ ہر بحر کے لیے ایسی مترنم اور موزوں لے چن لیتے تھے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے تھے ۔ ان کا ابتدائی زمانے کا ایک شعر ہے :

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبال
راگ ہے دین مرا ، راگ ہے ایمان میرا

جب انھوں نے بڑے مجمعوں اور قومی جلسوں میں شریک ہونا شروع کیا تو پہلے اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے تھے ۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو خبر ہو گئی کہ وہ خوش گلو اور خوش آہنگ بھی ہیں ۔ پھر کیا تھا ، ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ لے سے پڑھیں ۔ اس کے بعد تو ایسا ہو گیا کہ جب کبھی وہ تحت اللفظ پڑھنا چاہتے ، لوگ انھیں ترنم سے پڑھنے پر مجبور کر دیتے ۔

اقبال کی دیکھا دیکھی کئی موزوں طبع نوجوانوں اور بعض دوسرے شاعروں کو بھی یہ شوق دامنگیر ہوا کہ ان کے طرزِ ترنم کا تتبع کریں ۔ اب جسے دیکھو وہ اپنا کلام اقبالی لہجے میں پڑھ

کر سنا رہا ہے ۔ شاید اقبال نے اسی بنا پر کہا تھا :

''چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری''

مشہور ریاضی دان خواجہ دل محمد مرحوم پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور ، جنھوں نے شاعری میں بھی نام پیدا کیا ہے ، اس وقت نوجوان تھے اور اقبال کی آواز کا چربہ اتارنے میں بہت کامیاب سمجھے جاتے تھے ۔ ان کی لے آخری دم تک سننے میں آتی رہی مگر اب اس میں وہ ابتدائی اقبالی رنگ باقی نہیں رہا تھا ۔

مرزا ارشد گورگانی ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے ۔ انھوں نے اقبال کی روز افزوں مقبولیت دیکھ کر محسوس کیا کہ اقبال کی خوش آوازی تو ان کی نظم کو پر لگا دیتی ہے اور وہ اپنے ترنم کی بدولت محفل پر چھا جاتے ہیں مگر ان کے نقال وہاں تک نہیں پہنچ سکتے ۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرع کہا :

''نظم اقبالی نے ہر اک کو گویّا کردیا''

بات تو یہ درست تھی کہ بہت سے نوجوان اقبال کو دیکھ کر ترنم پر آمادہ ہو گئے تھے مگر اقبال کی ہر دلعزیزی کی اصل وجوہ اور تھیں ۔ ان کے کلام میں جدت اور خلوص اس وقت بھی موجود تھا جو بعد میں زیادہ پختہ اور نمایاں ہو گیا تھا ۔ فرماتے ہیں :

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقی :

یہ تھا وہ ماحول جس میں اقبال کی شاعری نے آنکھ کھولی ۔ اقبال کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کے ادبی رجحانات بھی آپ کے

سامنے ہیں - ان سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہوئے آگے بڑھے - وہ پہلے محض شاعر تھے جو مشاعروں میں اکثر دیکھے جاتے تھے - پھر وہ فلسفی اور مفکّر بنے اور ان کا کمال یہ تھا کہ آخری دم تک ان کی ذہنی نشو و نما برابر جاری رہی - وہ ترقی کرتے اور بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے ، یہاں تک کہ وہ غزل گو شاعروں کے حلقے سے ابھر کر پیغمبرِ خودی کہلائے اور انسانیت کو اونچے مقام پر لے گئے - ان کے ہم عصر دوسرے شعرا کے یہاں یہ ذہنی ارتقا نہیں ملتا - اقبال خود فرماتے ہیں :

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے[1]

● ● ●

۱- یہ مقالہ مجلہ اقبال لاہور ، اکتوبر ۵۴ع جلد ۳ نمبر ۲ اور اکتوبر ۵۵ع جلد ۴ نمبر ۲ میں شائع ہو چکا ہے اور بزمِ اقبال کی اجازت سے بعض اضافوں کے ساتھ دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے -

انجمن کشمیری مسلمانان

سو تدابیر کی اے قوم! یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار مین بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوّت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ ''کشمیر''

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ اقبال کی مجلسی زندگی کا آغاز ۱۸۹۶ع میں لاہور کے مشاعروں سے ہوا جو بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں ۱۸۹۰ع سے انجمنِ مشاعرۂ اتحاد کے زیر اہتمام منعقد ہوتے تھے - اس سے قبل لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے -[1] اس کے بعد قومی اجتماعات اور ملکی صحافت میں ان کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا - چنانچہ ۱۸۹۹ع میں اقبال نے 'نالۂ یتیم' کے عنوان سے، ۱۹۰۰ع میں 'یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' اور ۱۹۰۱ع میں 'ابرِ گہربار' کے عنوان سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں چند غیر فانی نظمیں پڑھیں - پھر شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالہ 'مخزن' کے پہلے پرچے میں، جو اپریل ۱۹۰۱ع میں جاری ہوا، اقبال کی پہلی نظم 'ہمالہ' شائع کی -[2] لیکن اقبال کی رودادِ زندگی نامکمل رہے گی اگر اس جگہ انجمنِ کشمیری مسلمانان لاہور کا ذکر نہ کیا جائے جو اقبال کو کشمیری برادری کے بزرگوں سے روشناس کرانے کا ذریعہ بنی اور پھر چراغِ خانہ سے شمعِ انجمن بننے میں مد و معاون ثابت ہوئی -

اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ فروری ۱۸۹۶ع میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے ایک انجمن

۱- مقدمہ ''بانگِ درا'' از سر عبدالقادر مرحوم -

۲- محمد احمد خاں : اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۱۶ - نیرنگ خیال، اقبال نمبر، ص ۳۱ - ۳۲ -

'کشمیری مسلمانان' کے نام سے قائم کی تھی جس کے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل تھے :

(۱) اصلاحِ رسوم شادی و غمی ۔

(۲) کشمیری مسلمانوں میں تعلیم ، تجارت ، صنعت و حرفت اور زراعت کو رواج دینا ۔

(۳) قوم میں اتحاد و اتفاق بڑھانا ۔

اقبال اس وقت سیالکوٹ سے نئے نئے لاہور آئے تھے اور گورنمنٹ کالج میں بی ۔ اے کے ایک ہونہار اور ذہین طالب علم تھے ۔ وہ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں شریک ہونے سے پہلے اس انجمن کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے اور اس کی مجالس میں پرجوش نظمیں پڑھتے تھے ۔ اس انجمن کے قیام پر پہلی مجلس میں اقبال نے ایک نظم پڑھی جو ان کے ولایت سے واپس آنے کے بعد مارچ ۱۹۰۹ع کے کشمیری میگزین میں ان کی نظرثانی اور اجازت کے بعد شائع ہوئی ۔ وہ نظم یہ ہے :

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں
بدن میں جاں تھی کہ جیسے قفس میں صیدِ زبوں

چڑھائی فوج الم کی ہوئی تھی کچھ ایسی
علم خوشی کا مرے دل میں ہوگیا تھا نگوں

کیا تھا کوچ جو دل سے خوشی کی فوجوں نے
لگائے خیمہ تھے واں رنج کے جنود و قشوں

غم و الم نے جگر میں لگا رکھی تھی اک آگ
بنا ہوا تھا مرا سینہ رشکِ صد قانوں

زبسکہ غم نے پریشاں کیا ہوا تھا مجھے
یہ فکر مجھ کو لگی تھی کہ ہو نہ جائے جنوں

جو سامنے تھی مری قوم کی بُری حالت
امڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا سیحوں
انھی غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی
کہ بیت قوم کی اصلاح کے ہوئے موزوں
پئے مریض یہ اک نسخۂ مسیحا تھا
کہ جس کو سن کے ہوا خرمی سے دل مشحوں
غبار دل میں جو تھا کچھ فلک کی جانب سے
دبے اسی میں غم و رنج صورتِ قاروں
ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم
یقین ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں
ملے گا منزلِ مقصود کا پتا ہم کو
خدا کا شکر کہ جس نے دیے یہ راہ نموں
ہلال وار اگر منہ میں دو زبانیں ہوں
ادا نہ پھر بھی ہو شکر خدائے کن فیکوں
مثال شانہ اگر میری سو زبانیں ہوں
نہ طے ہو زلفِ رہ شکرِ ایزدِ بیچوں
چلی نسیم یہ کیسی کہ پڑ گئی ٹھنڈک
چمن ہوئی مرے سینے میں نارِ سوزِ دروں
یہ کیا خوشی ہے کہ دل خود بخود یہ کہتا ہے
بعید رنج سے اور خرمی سے ہوں مقروں
خوشی سے آ کے خدا جانے کیا کہا اس نے
اچھل رہا ہے مثالِ تموّجِ جیحوں
کرم سے اس کے وہ صورت فلاح کی نکلی
کہ حصنِ قوم ہر اک شر سے ہو گیا مصئوں

خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے
سمجھ گئے ہیں تری چال گنبدِ گردوں

چراغِ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں
ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا دُرِ مکنوں

مزا تو جب ہے کہ ہم خود دکھائیں کچھ کر کے
جو مرد ہے نہیں ہوتا ہے غیر کا ممنوں

بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یا رب!
کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں

اسی سے ساری امیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے
وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ ستوں

دعا یہ تجھ سے ہے یارب کہ تا قیامت ہو
ہماری قوم کا ہر فرد قوم پر مفتوں

جو دوڑ کے لیے میدان علم میں جائیں
سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں

کچھ ان کو شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے
ہماری قوم پہ یا رب وہ پھونک دے افسوں

دکھائیں فہم و زکا و ہنر یہ اوروں کو
زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال صورتِ مضموں

یہ نظم اگرچہ بالکل ابتدائی مشق کے زمانے کی ہے اور اس کا انداز بھی پرانا ہے تاہم اس میں ماضی و حال کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور مستقبل کے لیے ایک پیغام بھی موجود ہے ۔ مگر یہ انجمن تھوڑا عرصہ قائم رہ کر ۱۸۹۷ع کے وسط میں بند ہو گئی اور

دسمبر ۱۹۰۱ء میں 'کشمیری گزٹ' لاہور کی تحریروں سے دوبارہ زندہ ہوئی۔ یہ ماہانہ گزٹ چودھری جان محمد گنائی نے ستمبر ۱۹۰۱ء میں منشی محمد الدین فوق کی ادارت میں جاری کیا تھا اور کشمیری قوم کا ترجمان تھا۔

انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ کارکنانِ انجمن کے پاس چونڈہ ضلع سیالکوٹ سے کسی صاحب نے شکایت کی کہ ایک تحصیلدار نے اپنے کسی فیصلے میں کشمیریوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بڑے فسادی اور بہادر ہوتے ہیں۔ 'فسادی' کا لفظ مٹانے اور ہٹانے کے لیے اس فیصلے کے خلاف انجمن کو اپیل دائر کرنی چاہیے۔ اقبال اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ آپ نے اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ''میں تو اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو قوم فساد کرنا نہیں جانتی وہ بہادر نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب 'فساد' سے بہادری کی سپرٹ ہے۔[1] اگر آپ بہادر اور شجاع نہیں کہلانا چاہتے تو بے شک اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کریں۔'' اس رائے کو سب نے پسند کیا اور آخر اپیل دائر کرنے کی تجویز مسترد کردی گئی۔

دسمبر ۱۹۰۱ء کے 'کشمیری گزٹ' لاہور میں اقبال کے چند

۱۔ فساد کا لفظ ان معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ نہ اُردو میں نہ عربی میں۔ قرآن مجید میں بھی جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اس سے بھی اقبال کے خیالات کی تائید نہیں ہوتی۔ پھر 'فسادی' کہہ کر تحصیلدار کی نیت کشمیریوں کی تعریف کرنا نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس وقت ایک لطیفے کے طور پر بیان کی گئی جو چل گئی اور حاضرین نے اسے پسند کیا۔

قطعات بھی ملتے ہیں جو انہوں نے انجمن کشمیری مسلمانان لاہور ہی کے کسی اجلاس میں پڑھ کر سنائے تھے ۔ ملاحظہ ہوں :

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے
اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفلِ احباب ہے
ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

ظلم سہتے ہیں وطن اپنا نہ جن سے چھٹ سکا
شکوۂ حکام پھر اے دل نہیں تیرا بجا
کیا عجب کشمیر میں رہ کر جو ہے ان پر جفا
پائے گل اندر چمن دائم پر است از خار ہا

سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے
جیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گہِ مولائے جلیل
عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

موتی عدن سے ، لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے

ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنّت نظیر ہے

پنجۂ ظلم و جہالت سے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دست جفا کیش کو یارب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یادِ ایامِ گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوّت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ 'کشمیر'

ان قطعات میں اقبال نے اپنے سوز و ساز سے قوم کے سامنے اجتماعی نظام کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس کے رنگ و آہنگ سے ان کا نورِ بصیرت جگمگا رہا ہے ۔ آخری قطعے کا آخری مصرع ''مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر'' ساری عمر اخبار کشمیری لاہور کا ماٹو رہا ۔

جب اقبال ایم ۔ اے پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ ، فلسفہ اور سیاستِ مدن کے لکچرار مقرر ہوئے تو انھیں

اس انجمن کا سیکریٹری بنا دیا گیا - منشی محمد الدین فوق اسسٹنٹ سیکریٹری کی حیثیت سے ان کے دستِ راست تھے -

۱۹۰۳ع میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے - ۱۹۰۵ع میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت چلے گئے جہاں سے پی ایچ - ڈی - اور بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۸ع میں واپس آئے اور آپ نے لاہور میں وکالت شروع کی - اس کے ساتھ ہی آپ کو انجمن کشمیری مسلمانان کا جنرل سیکریٹری بنا دیا گیا - اس وقت انجمن کے دوسرے عہدہ دار حسبِ ذیل تھے :

صدر ــــ خان بہادر خواجہ اللہ بخش -

نائب صدر ــــ میاں شمس الدین رئیس و میونسپل کمشنر ، خواجہ کریم بخش اکونٹنٹ ، میاں نظام الدین رئیس ، خواجہ کمال الدین بی - اے وکیل ، شیخ محمد کاظم سپرنٹنڈنٹ ڈاک خانہ جات ، سید محمد شاہ وکیل ، حاجی میر شمس الدین ، ڈاکٹر محمد الدین ناظر -

جنرل سیکریٹری ــــ داکٹر شیخ محمد اقبال ، ایم - اے ، پی ایچ-ڈی ، بار ایٹ لاء -

جائنٹ سیکریٹری ــــ منشی حیدر محمد ہیڈ کلرک ریلوے (برادرِ کلاں عزت مآب شیخ دین محمد) -

اسسٹنٹ سیکریٹری ــــ منشی محمد الدین فوق -

فنانشل سیکریٹری ــــ منشی معراج الدین ڈرافٹسمین ریلوے -

محاسب ــــ منشی قادر بخش اکونٹنٹ نوٹ گھر -

ان کے علاوہ خواجہ رحیم بخش ای - اے - سی ، منشی محمد حفیظ ، شیخ خان محمد ڈپٹی پوسٹ ماسٹر ، بابو نبی بخش بی - اے انسپکٹر

ڈاک خانہ جات ، شیخ دین محمد ایم - اے پروفیسر مشن کالج لاہور (آنریبل جسٹس و سابق گورنر سندھ) ، شیخ برکت اللہ ڈپٹی انسپکٹر مزنگ ، منشی احمد دین اکونٹنٹ نہر ، بابو نبی بخش ٹھیکدار ریلوے ، خواجہ امیر بخش ہیڈ کلرک محکمہ جنگلات وغیرہ وغیرہ نہ صرف کشمیری برادری کے چند درخشندہ ستارے تھے بلکہ لاہور کے تمام مسلمانوں کے سربرآوردہ رکن بھی تھے کیونکہ ان میں اکثر افراد ایسے تھے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کی ہر جماعت بالخصوص انجمن حمایت اسلام سے گہرا تعلق تھا ۔

۲۷ ، ۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۰۸ع کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا ۔ آنریبل نواب بہادر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں[1] ، سی - ایس - آئی ، کے - سی - ایس - آئی نواب آف ڈھاکہ اس کے صدر تھے ۔ چونکہ وہ بھی کشمیری تھے اس لیے اہلِ خطہ برادری کے بہت سے بزرگ شوقِ ملاقات میں پنجاب کے مختلف شہروں سے کھنچ کر امرتسر پہنچے ۔ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور نے نواب صاحب کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا ۔ چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۸ع کو ایک وفد غیر رسمی طور پر ایڈریس کا وقت مقرر کرنے کے لیے

۱- وہ ۱۸۸۴ع میں بمقام ڈھاکہ پیدا ہوئے ۔ ان کے والد بزرگوار نواب سر احسن اللہ کی فیاضیاں نہ صرف ڈھاکہ بلکہ پورے بنگال میں مشہور تھیں ۔ ڈھاکہ کی برق روشنی ، واٹر ورکس ، شفا خانہ ، بورڈنگ ہاؤس اور یتیم خانہ وغیرہ نواب صاحب کی ذاتی فیاضیوں کے مظاہر تھے ۔ مسلم لیگ کے سب سے پہلے صدر بھی غالباً آپ ہی تھے ۔ آپ کا خاندان کشمیر سے ترک وطن کرکے ڈھاکہ میں آباد ہوا تھا ، اس لیے کشمیری مسلمانوں سے آپ کو خاص محبت تھی ۔

سرکٹ ہاؤس امرتسر میں حاضر ہوا - اس وفد میں خان بہادر خواجہ اللہ بخش ، مولوی احمد دین وکیل ، خواجہ رحیم بخش ای - اے - سی ، خواجہ امیر بخش ، حاجی میر شمس الدین جنرل سیکریٹری انجمن حمایت اسلام ، منشی غلام محمد خادم ، منشی محمد الدین فوق ، بابو غلام حسین اور بابو حیدر محمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں -

خان بہادر اللہ بخش نے ہر ایک کا تعارف کرایا اور حاضری کی علتِ غائی بیان کی - نواب صاحب نے دستِ شوق بڑھا کر ہر ایک سے مصافحہ کیا اور وفد سے ملنے کے لیے ۲۸ دسمبر کی شام کا وقت مقرر کیا - چنانچہ دوسرے روز سیالکوٹ ، امرتسر ، راولپنڈی ، گوجرانوالہ ، سرگودھا ، لائل پور ، لدھیانہ ، گورداس پور ، وزیرآباد ، ڈیرہ غازی خان ، جیکب آباد ، سندھ وغیرہ مقامات کے نمائندوں کا ایک وفد وقت مقررہ پر سرکٹ ہاؤس امرتسر میں پہنچا - اقبال اس وفد میں شامل تھے - انھوں نے نہایت بلند آواز سے فارسی زبان میں سپاس نامہ پڑھا جو پہلے سے طبع شدہ تھا اور جس کا ابتدائی مسودہ ڈاکٹر محمد دین ناظر مرحوم نے تیار کیا تھا - راقم الحروف کے پاس اس کی ایک کاپی موجود ہے -

اس سپاس نامے میں نواب صاحب کے خیر مقدم کے بعد ترکِ کشمیر کا تذکرہ تھا اور پھر لکھا تھا کہ کشمیری قوم نے باوجود اجنبی ہونے کے علوم و فنون اور حصولِ مراتب و وجاہت میں وہ کوشش کی ہے کہ مقامی اقوام ان کی ذہانت اور طباعی دیکھ کر دنگ رہ گئی ہیں - ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے قومی بھائیوں یعنی اہلِ خطہ مسلمانان پنجاب کی سرپرستی قبول فرمائیں تاکہ جمیعت قومی کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور ہماری ضروریات قومی اور حفاظت حقوق کی کوششیں جاری رہ سکیں -

یہ سپاس نامہ چونکہ نایاب ہے اس لیے اقبال کی ایک یادگار سمجھ کر یہاں درج کیا جاتا ہے:

''الحمد للہ امروز ساعت سعید بل روز عید کہ ما اہل خطہ از مختلف مقامات صوبہ پنجاب بخدمت اقدس برائے خیر مقدم جناب والا حاضر شدیم و از شرف ملاقات مشرف گشتیم:

اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما
ذکر تو بود زمزمۂ شادیٔ ما

پوشیدہ نیست کہ اسلاف ما بغرض سیر و سیاحت و ترقیٔ تجارت و حصول روزگار راہ غربت گرفتند و از قطعۂ جنت نظیر خویش انفراق نمودہ دریں ملک ہندوستان بہ مقامات مختلفہ اقامت ورزیدند و در صورت اجنبی زندگانی می کردند۔ ہنگامیکہ آفتاب اقبال مغربیہ بہ ہندوستان طلوع نمود اقوام مختلفۂ ایں دیار از علوم مغربیہ بہرہ اندوز گشتند۔ دراں زمان ایں بزرگان خطہ باوجود مشکلات مہاجرت در ایں راہ قدم نہادند و افتاں و خیزاں خویشتن را بجائے رسانیدند کہ امروز باعتبار علوم و فنون و حصول مراتب و وجاہت دنیویہ و ادائے فرائض دینیہ و بہ نظر تہذیب اخلاق و خیر خواہیِ دولتِ انگلشیہ در صف اقوام ترقی یافتہ جا گرفتند۔ ازاں جا کہ اہل خطہ را از فضل ایزد منان در ملک ہندوستان جمعیت قومی بحصول پیوستہ کشمیریان صوبۂ پنجاب بہ کمال آرزو مندی برائے قبولیت عہدۂ پیٹرن بحضور والا عرض رسان اند و اُمیدوارند کہ جناب والا از منظوریِ ایں درخواست جملہ برادران خطہ را مشکور و ممنون سازند و در انصرام ضروریات قومی و

حفاظت حقوق اہل خطہ بیشتر از پیشتر سعی فرمایند ۔
ما ازاں خیرخواہی دولت برطانیہ کہ از طریق عمل جناب ظاہر و ثابت شدہ است و می شود بر خود می‌نازیم :

از بیم جان و مال ہراساں نہ گشتہ ای
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

گورنمنٹ عالیہ کہ از راہ الطاف خسروانہ اعزاز بزرگ یعنے عہدۂ ممبر کونسل ہائے جناب والا صفات را عطا فرمودہ است ، ما اہل خطہ شکریہ‌ٔ ایں نعمت ادا کردن نمے توانیم و بدرگاہ خداوند کریم دعا مے کنیم کہ حکومت برطانیہ را بر جادۂ مستقیم برقرار داراد :

ایں دعا از ما و از جملہ جہاں آمین باد''

نواب صاحب نے اس سپاس نامے کا جواب انگریزی میں دیا جس کا خلاصہ یہ ہے :

''صاحبو ! نہیں نہیں بھائیو ! میں آپ کے سپاس نامے اور ملاقات سے بہت خوش ہوا ۔ میں اس وقت اپنے بھائیوں کے درمیان ہوں اور ان کی ہر خدمت کے لیے جو مجھ سے ممکن ہے حاضر اور تیار ہوں ۔ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں آپ کی قومی انجمن کا پیٹرن (مربّی) بنوں ۔ میں ہر چند اس قابل نہیں لیکن آپ کی خوشی کو مد نظر رکھ کر آپ کی خواہش منظور کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ میری قوم حکومت کی وفادار اور جاں نثار ہے ۔''[1]

ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ‌ٔ صدارت میں نواب صاحب نے

۱۔ خلاصہ از کشمیری میگزین لاہور ، بابت جنوری ۱۹۰۹ع ۔

اعزازِ صدارت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا :

"اگرچہ میری حالت صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں اتنی دور کا سفر اختیار کروں اور اس شان دار مجمع میں شریک ہوں مگر آپ حضرات کے اخلاص نے مجھے مجبور کیا اور ڈھاکے سے یہاں تک کھینچ لیا ۔ ڈھاکہ امرتسر سے سینکڑوں منزل پر واقع ہے مگر میں یقین کرتا ہوں اور یقین کرنے کے کافی وجوہ میرے پاس موجود ہیں کہ میں اپنے وطن میں ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ امرتسر کی آبادی پنجاب میں بہ لحاظ کشمیری آبادی کے بہت زیادہ ہے اور اپنے خواص اور پیداوار اور صنائع کے اعتبار سے ثانیِ سرینگر ہے ، اور شاید آپ حضرات واقف ہوں گے کہ میں کشمیری الاصل ہوں ۔ اس حیثیت سے اپنے موجودہ وطن سے جس قدر آگے بڑھوں گا اصلی وطن یعنی کشمیر مجھ سے قریب تر ہوتا جائے گا ۔"

اقبال کی تحریک سے نواب صاحب نے ۵ فروری ۱۹۰۹ء کو وائسریگل لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں حکومت ہند سے یہ سوال بھی پوچھا کہ "آیا کشمیری فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟ اگر ہو سکتے ہیں تو آج کل کتنے کشمیری سرکاری فوجوں میں ہیں ؟ نیز امرتسر اور سرحدِ کشمیر پر جو کشمیری آباد ہیں کیا وہ پنجاب کے قانونِ انتقالِ اراضی کی تعریف میں شامل ہیں یا نہیں ؟"

اس سوال کے جواب میں لارڈ کچنر نے حکومت ہند کی طرف سے کہا کہ "کشمیری قوم کے فوج میں بھرتی ہونے پر کوئی روک ٹوک نہیں مگر رجمنٹوں میں چونکہ ان کی کلاس کمپوزیشن نہیں یعنی کوئی کمپنی پلٹن میں یا کوئی ٹروپ رسالے میں کشمیریوں کے

لیے مخصوص نہیں اس لیے ہندوستانی فوج میں کوئی کشمیری بھرتی نہیں ہوتا۔"

اسی طرح مسٹر ملز نے حکومت کی طرف سے جواب دیا کہ "جو کشمیری امرتسر اور حدودِ کشمیر میں رہتے ہیں، پنجاب کے قانونِ انتقالِ اراضی کی رو سے ان پر کچھ خراب اثر نہیں پڑا۔ پنجاب میں کاشت کار قوم مشتہر ہونے کے لیے کشمیریوں کو حکومت پنجاب سے درخواست کرنی چاہیے۔ پنجاب گورنمنٹ کو حکومت ہند سے دریافت کیے بغیر ہر قوم کو کاشت کار مشتہر کر دینے کا اختیار ہے۔"۱

اس سلسلے میں اقبال کے کئی مراسلے اس وقت کے اخباروں میں نظر آتے ہیں جن کے ذریعے سے فوجی بھرتی اور حصولِ اراضی کی ضرورت اور اہمیت برادری اور حکام دونوں پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ایک مراسلے کا مضمون ملاحظہ ہو:

"برادر مکرم و معظم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،
آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ ہمارے مربی و محسن جناب نواب سر آنریبل خواجہ محمد سلیم اللہ صاحب نواب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای نواب ڈھاکہ نے ۵ فروری ۱۹۰۹ع کی وائسریگل کونسل میں کشمیریوں کے متعلق فوج اور زمینداری کی بابت سوالات پیش کیے تھے۔ فوج کے متعلق تو لارڈ کچنر صاحب بہادر کمانڈر انچیف افواج ہند نے فرمایا کہ "کشمیری مسلمانوں کو

۱۔ سول اینڈ ملٹری نیوز لدھیانہ، کشمیری میگزین، بابت مارچ ۱۹۰۹ع۔

فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے ، اگرچہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیحدہ موجود نہیں۔" اس امر کے متعلق انجمن کشمیری مسلمانان لاہور علیحدہ کوشش کر رہی ہے۔ مگر فی الحال میں آپ کی توجہ دو سوالوں کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں۔ زراعت پیشہ اقوام کے متعلق جو جواب نواب صاحب کے سوال کا دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ لوکل گورنمنٹ جس قوم کو مناسب سمجھتی ہے اقوام بندی زمینداری میں شامل کر لیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب کو یہ دونوں سوال اور جواب زمینداری کے متعلق حضور وائسرائے بہادر نے بھیج دیے تھے۔ گورنمنٹ ممدوح نے حکم جاری فرمایا ہے کہ کمشنر اپنے اپنے علاقے کی مفصل رپورٹ کریں کہ آیا کشمیری مسلمان اقوام بندی زمینداری میں شامل کر لیے جائیں یا کیے جانے کے لائق ہیں۔ کمشنر صاحب بہادر نے ڈپٹی کمشنروں کے نام حکم صادر فرمایا ہے کہ وہ ان کو اس معاملے میں مدد دیں۔ ڈپٹی کمشنروں نے تمام کشمیری زمینداروں کی ایک فہرست مرتب کرائی ہے جس سے ان کو معلوم ہوگا کہ پنجاب میں کتنے کشمیری زراعت پیشہ ہیں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب سیالکوٹ کا حکم نہایت صاف ہے۔ انھوں نے تحصیل داروں سے چار امور دریافت فرمائے ہیں ، یعنی :

(۱) قوم کشمیری کے افراد کا عموماً کیا پیشہ ہے ؟

(۲) کس قدر کشمیری ایسے ہوں گے جن کا گزارہ صرف زراعت کاری پر ہے ؟

(۳) اگر وہ مالکانِ اراضی ہیں تو کب سے انھوں نے زمین حاصل کی ہے ؟

(۴) کوئی کشمیری دخیل کار ہے یا نہیں ؟

اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ مفصلات اور شہروں میں بود و باش رکھنے والے زراعت پیشہ کشمیریوں کی جو فہرست تیار ہوگی اس میں مندرجہ بالا چار امور کا خیال رکھا جائے گا۔

آپ مہربانی فرما کر تحصیلدار صاحبوں کو اس فہرست کے مرتب کرنے میں خود بھی امداد دیں اور دیکھیں کہ یہ فہرست بموجب حکم صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر تیار کی جاتی ہے یا نہیں۔ تمام اہلِ خطہ کو جو آپ کے علاقے میں رہتے ہیں اچھی طرح سمجھا دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے گاؤں میں فہرست تیار کرنے میں امداد دیں تاکہ مکمل فہرست تیار ہو اور ہماری گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ کشمیری کس قدر پنجاب میں زمیندار ہیں اور زمینداری کا کام کرتے ہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ یہ فہرست بموجب حکم صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر تیار نہیں ہوئی تو صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں مودبانہ درخواست کریں کہ وہ ان کے بموجب حکم تیار کرنے کا صادر فرمائیں۔

جو نقشہ کہ تیار ہو رہا ہے اس کی ایک نقل انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے پاس جس قدر جلد ممکن ہو سکے ارسال فرمانے کی کوشش کریں۔

یہ چٹھی اپنے بھائیوں کو، جو مفصلات میں رہتے ہیں،

جلد بھیج دیں تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ کس قسم کی فہرست تیار ہونی چاہیے - اگر وہ دیکھیں کہ فہرست بموجب حکم بالا تیار نہیں ہوئی یا نہیں ہوتی تو وہ آپ کی معرفت صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے خط و کتابت کریں - اس غرض کے لیے کہ مندرجہ بالا امر میں تمام قوم کے افراد متفقہ طور پر اپنی بہبودی کے لیے کوشش کریں ، نیز دیگر امور کے لیے جو قوم سے بحیثیت مجموعی تعلق رکھتے ہوں ، میں تحریک کرتا ہوں کہ آپ اپنے سنٹر (مرکز) میں ضرور کشمیری مجلس قائم کریں - اس کے علاوہ ہر ایسے مقام میں جہاں آپ کا اثر ہو ، اپنے دیگر بھائیوں کو کشمیری مجلس قائم کرنے کی ترغیب بھی دیں کیونکہ اس طریق سے نہ صرف قوم کے افراد میں اتحاد و یگانگت کی صورت پیدا ہوگی بلکہ قومی حقوق کی حفاظت اور توسیع میں بھی سہولت ہوگی -

خاکسار

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لاء ، جنرل سیکریٹری

انجمن کشمیری مسلمانان ، لاہور''[۱]

دوسری چٹھی جو اقبال نے بعض قومی کمیٹیوں اور بزرگانِ قوم کی خدمت میں چھاپ کر بھیجی ، یہ تھی :

''فوجی ، زمینداری اور مردم شماری کا مسئلہ''

''برادر مکرم و معظم ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ !
انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی طرف سے پہلے بھی مسئلہ

۱- کشمیری میگزین لاہور ، مئی ۱۹۰۹ء -

زمینداری کے متعلق ایک مطبوعہ چٹھی بعض قومی کمیٹیوں اور بزرگانِ قوم کی خدمت میں ارسال کیے جانے کے علاوہ کشمیری میگزین بابت مئی ۱۹۰۹ع میں شائع ہوئی ہے جو اُمید ہے تمام برادران کی نظر سے گزری ہوگی۔ اس مسئلے پر دیگر قومی کمیٹیوں کے علاوہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور بھی غور کر رہی ہے بلکہ اس نے ایک چٹھی بخدمت صاحب سینئر سیکریٹری جناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر صوبہ پنجاب بدیں مضمون ارسال کی ہے کہ کشمیری زمینداروں کی فہرست اقوام بندی صرف ضلع سیالکوٹ و گورداسپور تک ہی محدود نہ رہے بلکہ یہ حکم از راہ الطاف خسروانہ دیگر اضلاع مثلاً گوجرانوالہ، لاہور، امرتسر، جہلم، راولپنڈی، لدھیانہ، اٹک، ہزارہ وغیرہ میں بھی، جہاں کشمیری آبادی کثرت سے ہے، نافذ فرمایا جائے۔ صاحب ممدوح کی خدمت میں ایک نقشہ بھی اس مضمون کا ارسال کیا گیا ہے کہ فہرست کس طریق سے تیار ہونی چاہیے۔ جواب آنے پر سب بھائیوں کو بذریعہ میگزین اطلاع دی جائے گی۔

فوجی مسئلے کی ضرورت اور اہمیت سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ اس مسئلے کے متعلق خاموشی اس لیے ہے کہ ہمارے مربی و محسن نواب بہادر سر خواجہ محمد سلیم اللہ صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، سی۔ آئی۔ ای نواب آف ڈھاکہ نے اپنی ایک تازہ چٹھی بنام جنرل سیکریٹری انجمن کشمیری مسلمانان لاہور میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ صاحب کمانڈر انچیف بہادر افواج ہند سے ملاقات

کر کے اس مسئلے کی نسبت فیصلہ فرمائیں گے ۔ اب نواب صاحب ممدوح کو تمام امور متعلقہ خدمات فوجی سے آگاہی کی ضرورت ہے تاکہ پوری واقفیت حاصل کر کے حضور کمانڈر انچیف بہادر سے گفتگو کر سکیں اور صراحت و وضاحت سے اپنے بھائیوں کی مردانگی اور جان نثاری اور ان کی فوجی خدمات کا تذکرہ کر سکیں ۔ ایسا مصالحہ بہم پہنچانا معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی ایک شخص یا ایک کمیٹی کا کام ہے ۔ جب تک تمام برادری متفقہ کوشش سے اس میں ہاتھ نہ بٹائے گی یہ کام سرانجام نہ ہوگا ۔ اس لیے سب بھائیوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ کشمیری انجمن لاہور کو اس معاملے میں مدد دیں اور نقشہ ملازمان اہل خطہ فوج کو جو لف ہذا ہے ، اچھی طرح سے پُر کر کے جتنی جلدی ہو سکے ، جنرل سیکریٹری کو واپس ارسال فرمائیں تاکہ نواب صاحب بہادر کی خدمت میں افواجِ ہند کے کشمیری بہادروں کی مکمل فہرست ارسال کر دی جائے ۔ آپ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ اس نقشے سے کسی طرح ہمارے ان بھائیوں کو ، جو اس وقت صیغۂ فوج میں ملازم ہیں نقصان پہنچے گا ۔ نقصان پہنچنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا اور خود کمانڈر انچیف بہادر تسلیم کر چکے ہیں کہ کشمیری مسلمان فوجوں میں ملازم ہیں ۔ ان کے لیے کوئی بندش اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے ، البتہ ان کی تعداد تھوڑی ہے ۔ لاہور کی کمیٹی ، جس میں ہماری برادری کے اکثر اہل الرائے اور قانون دان بزرگ شامل ہیں ، اپنے بھائیوں کے

اس خیال پر کافی سے زیادہ غور کر چکی ہے اور وہ ہر طرح مطمئن ہے۔ بلکہ ایسی فہرستوں کے مرتب ہونے سے قومی فائدے کی بہت بڑی توقع رکھتی ہے۔

کمیٹی کوشش کر رہی ہے کہ ہمارا ایک ڈیپوٹیشن ، جس میں ہماری برادری کے معزز فوجی پنشنر عہدہ دار خصوصیت سے شامل ہوں ، بسرپرستی نواب بہادر آف ڈھاکہ صاحب بہادر کمانڈر انچیف کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہو کہ کشمیری مسلمانوں کی رجمنٹ یا مختلف رجمنٹوں میں یا رسالوں میں کمپنی علیحدہ بنائی جانے کا حکم صادر فرمایا جائے۔ اگر برادرانِ قوم نے فہرستیں اور نقشے مکمل کرکے جلد تر واپس کر دیے تو غالب توقع ہے کہ گورنمنٹ ضرور ہماری گزارش پر توجہ فرمائے گی۔

اس چٹھی کے ساتھ علاوہ نقشہ ملازمان اہل خطہ فوج کے ایک نقشہ مردم شماریِ اہلِ خطہ کا بھی ہے۔ اس کی خانہ پری بھی ضروری ہے۔ اس نقشے سے نہ صرف اپنی برادری کی صحیح مردم شماری ہی دریافت کرنا مقصود ہے بلکہ یہ امر بھی ، جیسا کہ نقشے کے ملاحظے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا ، مدِ نظر ہے کہ قوم کے خواندہ اور ناخواندہ اور بے کار اور باکار اصحاب کا حال بھی معلوم ہو جائے تاکہ کمیٹی حتی المقدور اپنے بھائیوں کو کسی قسم کی امداد پہنچا سکے۔ دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم زندہ قوموں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ جس قدر قومیں آج آپ کو مہذب ، شائستہ

اور ترقی یافتہ نظر آتی ہیں وہ سب علم کے زینے ہی سے آسمانِ عروج و کمال پر پہنچی ہیں ۔ آپ کو یاد رہے کہ آپ میں بھی وہ سچے موتی اور جواہر موجود ہیں جن کی چمک دمک سے دنیا حیران اور خیرہ ہو سکتی ہے ، لیکن صرف جلا کی ضرورت ہے اور جلا تعلیم کے ذریعے ہی سے ہو سکتی ہے ۔

آخر میں پھر یہ گزارش کرتا ہوں کہ دونوں نقشے فوجی اور مردم شماری بہت جلد پُر کرکے واپس ارسال فرمائیں ۔ اگر یہ نقشے ختم ہو جائیں تو آپ لاہور کمیٹی سے اور طلب فرما سکتے ہیں یا اسی نمونے کے اور نقشے دستی بنا سکتے ہیں ۔

قوم کا خادم ، (ڈاکٹر شیخ) محمد اقبال ایم ۔ اے بیرسٹر ایٹ لاء

لاہور ۔"[1]

انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کی بنیادوں پر بعد میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس لاہور عالم وجود میں آئی جس نے کشمیر میں بیداری پیدا کرنے اور تعلیمی کمی دور کرنے میں بڑا کام کیا ۔ اس کانفرنس کے بھی پہلے جنرل سیکریٹری اقبال تھے ۔ بعد میں سید محسن شاہ بی ۔ اے ، ایل ۔ ایل ۔ بی اس کے سیکریٹری ہوگئے تھے ۔ آج مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں جو مسلمان اعلیٰ عہدوں پر فائز نظر آ رہے ہیں ان میں اکثر اس کانفرنس کے تعلیمی وظائف کے رہینِ منت ہیں ۔

اس کانفرنس کے ابتدائی دو اجلاس تو لاہور ہی میں ہوئے جو

۱۔ کشمیری میگزین ، بابت جون ۱۹۰۹ع ۔

زیادہ تر لاہور ، امرتسر ، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ چند شہروں کے نمایندوں تک محدود تھے ۔ لیکن راولپنڈی ، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اجلاس مجمع اور اثر و اہمیت کے لحاظ سے بے نظیر تھے ۔ سیالکوٹ کے اجلاس کے صدر خان بہادر نواب خواجہ محمد اعظم رئیس ڈھاکہ تھے ۔ ان اجتماعوں میں کشمیری الاصل فوجی سردار بھی شامل ہوتے تھے جن میں کئی لفٹنٹ ، صوبیدار اور جاگیردار تھے ۔

ان ایام میں خواجہ احمد شاہ رئیس لدھیانہ اور خواجہ یوسف شاہ رئیس امرتسر پنجاب کونسل کے ممبر تھے ۔ وہ دونوں کشمیری تھے اور قومی معاملات میں خوب دلچسپی لیا کرتے تھے ۔ خواجہ احمد شاہ کی طرف سے لاہور میں انگریزی اخبار 'پنجاب آبزرور' جاری تھا جس کے ایڈیٹر مختلف وقتوں میں شیخ عبدالقادر ، شیخ عبدالعزیز اور ملک برکت علی رہے ہیں ۔ شیخ عبدالعزیز بی ۔ اے اپنے آپ کو آنریری (اعزازی) کشمیری کہا کرتے تھے ۔ وہ بعد میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے آنریری سیکریٹری اور پنجاب گورنمنٹ پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہو گئے تھے ۔ ادھر وہ اپنے اخبار میں کشمیریوں کے مطالبات کی زبردست حمایت کرتے تھے ، ادھر فوق صاحب 'کشمیری میگزین' میں کشمیری مسلمانوں کی بے کسی اور حکومت کشمیر کی بے توجہی کا قصہ چھیڑتے رہتے تھے ۔ لیکن اخباروں کی چیخ پکار اور کشمیری کانفرنس کے مقرروں کی دھواں دھار تقریروں کے باوجود دربار کشمیر کسی مطالبے پر کان نہ دھرتا تھا بلکہ قراردادوں اور شکایتوں کے پہنچنے کی رسید تک نہ دیتا تھا ۔

یہ حالات نہایت یاس انگیز اور حوصلہ شکن تھے لیکن ارکان کانفرنس نے ہمت نہ ہاری ۔ آخر ان کے عزم و استقلال کی بدولت ایک وقت آیا جب قراردادوں کی رسیدیں بھی آنے لگیں ۔ حکام سے

ملاقاتیں بھی ہونے لگیں اور کانفرنس کے وفد مہاراجہ سر پرتاب سنگھ کے سامنے اصالتاً اپنی شکایات پیش کرنے لگے ۔ دو ایک موقعوں پر اقبال نے بھی ان میں شامل ہو کر کشمیری کانفرنس کی ترجمانی کا حق ادا کیا ۔

۱۹۰۹ع یا ۱۹۱۰ع کی بات ہے کہ ایک مرتبہ کشمیری کانفرنس کا وفد مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ والیٔ کشمیر کی خدمت میں بمقام کشمیر ہاؤس (لاہور) جانے والا تھا ۔ فوق صاحب اقبال کو بلانے گئے ۔ اقبال اُن دنوں انار کلی والی بیٹھک میں رہتے تھے ۔ انھوں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ ''جو مہاراجہ دن کے بارہ بجے سے پہلے کسی مسلمان کا منہ دیکھنا گوارا نہیں کرتا میں کسی وقت بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا ۔ غضب خدا کا ایک ایسا شخص ، جس کے شہر جموں کا نام صبح ہی صبح لینا نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو تک منحوس سمجھتے ہیں ، اس منحوس شہر کا رہنے والا مسلمان کو منحوس سمجھ کر اس کی شکل سے نفرت کرتا ہے ۔''

فوق صاحب نے کہا ''یہ بات تو صحیح ہے کہ مسلمان بارہ بجے سے پیشتر اس کے پاس نہیں جا سکتے لیکن اس کی ایک وجہ بھی ہے وہ یہ کہ مہاراجہ صبح سویرے اُٹھ کر اشنان کرنے کے بعد پوجا پاٹ کرتے ہیں ۔ برہمن ان کے گرد ہوتے ہیں ۔ اس میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے ۔ عبادت سے فارغ ہو کر کچھ ناشتہ کیا جاتا ہے ، پھر حقہ بھرا جاتا ہے جس کے کش لگاتے لگاتے کھانے کا وقت آ جاتا ہے اور خواہ مخواہ بارہ بج جاتے ہیں ۔ تب کہیں جا کر ان کو برہمنوں اور رسوئی کے کاموں سے فرصت نصیب ہوتی ہے ۔ اسی لیے وہ اپنے وزیروں اور بڑے بڑے اہل کاروں کو بھی

بارہ بجے دوپہر سے ایک بجے تک ہی جے جے اور سلام کا موقع دیا کرتے ہیں،، لیکن ان باتوں سے اقبال کی تسلی کب ہو سکتی تھی - انھوں نے ایک نہ سنی اور نہ آئے -[۱]

وفد کے باقی ممبر وقتِ مقررہ پر کشمیر ہاؤس پہنچے - انھیں ایک چھوٹے سے خیمے میں بٹھایا گیا - دیوان امر ناتھ چیف منسٹر تھے - وہ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے - تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد باہر جاتے اور پھر خیمے میں آ کر باتوں میں مشغول ہو جاتے - ملاقات کا وقت آٹھ بجے شام تھا ، مگر جب نو بج چکے تو ایک آدمی دوڑا ہوا آیا اور دیوان صاحب کو خیمے سے باہر لے گیا - معلوم ہوا کہ مہاراجہ صاحب ، جو کسی کو اطلاع دیے بغیر اپنے گرو جی کے پاس چلے گئے تھے اور جن کی تلاش میں دیوان صاحب پریشان ہو رہے تھے ، تشریف لے آئے ہیں - تھوڑی دیر بعد سب کو بڑے کمرے میں بلایا گیا - غالباً اواخر دسمبر کے دن تھے - کمرے میں انگیٹھی سلگ رہی تھی اور مہاراجہ صاحب گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے - سب سلام کرکے فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ معروضات پیش کیں - مہاراجہ صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ''دیوان صاحب آپ سے گفتگو کر چکے ہیں ، وہ آپ کی باتوں کا خیال رکھیں گے - سرکار کو خود بھی خیال ہے،، اس کے بعد خاموشی ہو گئی - سب سلام کرکے چلے آئے لیکن حیران تھے کہ یہ کیسی ملاقات ہے - ایک طرف تو دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے اور دوسری طرف نشستند و گفتند و برخاستند کا معاملہ ہے -

پہلے وفد کی ناکامی کے بعد جب دوسرے سال مہاراجہ صاحب

۱- سرگزشت فوق (قلمی) ، ص ۱۳۰ - ۱۳۱ -

لاہور آئے تو کانفرنس نے پھر وفد لے جانے کا فیصلہ کیا ۔ اس دفعہ ایک میموریل بھی تیار کیا گیا جس کا لہجہ کسی قدر تلخ تھا ۔ دیوان بشن داس ہوم منسٹر اور وزیر تعلیمات تھے ۔ انھوں نے کہا کہ اس تحریر سے کوئی فائدہ نہ ہوگا ۔ بہتر یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہو زبانی کہہ دیجیے ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ اس وفد میں آنریبل خواجہ یوسف شاہ ممبر کونسل پنجاب ، خان بہادر شیخ غلام صادق رئیس امرتسر ، شیخ غلام حسین ای ۔ اے ۔ سی ، خان بہادر اللہ بخش اور سید محسن شاہ وغیرہ شامل تھے ۔ ریاست کی طرف سے اس موقع پر دیوان بشن داس ہوم منسٹر ، خان بہادر شیخ مقبول حسین ریونیو منسٹر اور ایک دو اور معزز افسر موجود تھے ۔ جب مہاراجہ کے ایما سے سب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو آپ نے چھوٹتے ہی فرمایا ''سرکار ہمیشہ فرشی دربار کیا کرتے ہیں لیکن آپ کی خاطر آج کرسیوں کا دربار لگایا گیا ہے ۔''

ارکانِ وفد نے شکریہ ادا کیا ۔ پھر خان بہادر شیخ غلام صادق ، آنریبل خواجہ یوسف شاہ اور خان بہادر خواجہ اللہ بخش باری باری مسلمانان کشمیر کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا ذکر کرتے رہے اور مہاراجہ کو ان کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دلاتے رہے ۔

مہاراجہ صاحب نے جو کچھ جواب میں ارشاد فرمایا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ دیوان بشن داس صاحب ان سے میموریل کے تند و تلخ لہجے کا ذکر کر چکے ہیں ۔ آپ نے فرمایا ''سرکار کو ساری خبر ہے کہ لیڈر کس طرح بنا کرتے ہیں ۔ جو شخص بہت باتیں کرتا ہے ، بس وہ لیڈر ہے ۔ جو تقریر یا تحریر میں تلخ لہجہ اختیار کرکے ادب و تمیز کی عنان ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے ، بس وہ لیڈر ہے ۔ جو ہندو مسلم فساد پیدا کرنے میں سب سے پیش پیش

ہے ، بس وہ لیڈر ہے - جو فرقہ وارانہ مطالبات پر زور دیتا ہے یا حکومت اور فرمانروا پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتا ہے ، بس وہ لیڈر ہے - آپ لوگوں کو اگر اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ ایسی ہی ہمدردی ہے تو کشمیر ہاؤس آ جانا تو آسان ہے - ذرا تکلیف اُٹھا کر کشمیر آئیے سرکار آپ کو دعوت دیتے ہیں - گھر بیٹھ کر باتیں بنانے سے کیا فائدہ ؟ وہ کشمیر ہے پنجاب نہیں ہے - ہم وہاں ہندو مسلم سوال پیدا نہ ہونے دیں گے -''

مہاراجہ صاحب ایک ہی سانس میں یہ سب باتیں کہہ گئے - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھوں نے زبانی یاد کر رکھی تھیں - خان بہادر خواجہ اللہ بخش تو پولیٹیکل مذاق کے آدمی تھے - انھوں نے فوراً کہا کہ سرکار کے عہد میں آج تک ہم نے ریاست میں ہندو مسلم فساد کا ذکر نہیں سنا - یہ الفاظ سرکار کے منہ ہی سے پہلی مرتبہ سنے ہیں - اگر خدا نخواستہ کبھی ایسا ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تو ہم اس فساد کو مٹانے اور امن قائم کرنے میں اپنی جانیں تک لڑا دیں گے - اور کشمیر آنے کی جو دعوت دی گئی ہے اس کے لیے اہلِ وفد دل و جان سے شکرگزار ہیں - اور بندہ تو بن بلائے ہی ہر سال حاضر ہوجاتا ہے - صرف ان لوگوں کے اطمینان کی ضرورت ہے -

مہاراجہ صاحب نے فرمایا ''کیا سرکار کی زبان پر اعتبار نہیں ؟ بس ہم نے کہہ دیا ہے ، یہی ہماری زبان اور یہی ہماری تحریر ہے -''

وفد کے لوگ حیران تھے کہ کس قسم کے مطالبات و معروضات لے کے آئے تھے اور کس قسم کا جواب لے کے جا رہے ہیں -[1]

آخر ایک مرتبہ اقبال کے دوست انھیں بھی مہاراجہ پرتاپ سنگھ

۱- سرگزشت فوق (قلمی) صفحہ ۷۹ - ۸۰ -

کے پاس لے ہی گئے - یہ بھی لاہور ہی کا واقعہ ہے - مہاراجہ کشمیر ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے - ڈاکٹر صاحب کا مہاراجہ سے تعارف کرایا گیا - بعض دوستوں نے اس ملاقات سے پہلے ہی مہاراجہ سے ڈاکٹر صاحب کی علمی شہرت اور ان کی شاعرانہ عظمت کا کچھ ذکر کر رکھا تھا - مہاراجہ صاحب بے تکلف ہو کر کہنے لگے -

''ڈاک دار صاحب ! سنا ہے آپ بیت بناتے ہیں -''

ڈاکٹر صاحب نے بھی شوخی سے جواب دیا : ''سرکار ! بیت نہ کبھی میں نے بنائے ہیں نہ میرے باپ دادا نے - اس کے علاوہ میں ڈاکہ دار بھی نہیں - نہ میں نے کبھی ڈاک کا کام کیا ہے نہ میرے بزرگوں نے -''

مہاراجہ صاحب اقبال کے ساتھیوں کا منہ دیکھنے لگے - انھوں نے کہا : ''حضور ! یہ شاعر ہیں اور شعر کہا کرتے ہیں - شعر کو بیت بھی کہتے ہیں - انھوں نے بیت کو وہ بیت (بید) سمجھا جس سے کرسیاں بُنی جاتی ہیں -''

مہاراجہ صاحب : ''ٹھیک کہا آپ نے - انھوں نے وہی بیت سمجھا ہوگا - اچھا ، کوئی شعر سنائیے -''

ڈاکٹر صاحب شعر پڑھنے لگے تو مہاراجہ نے فرمایا : ''نہیں صاحب ! یوں نہیں - گا کر پڑھیے ، اسی لیے میں جس کی آپ کے دوست تعریف کرتے ہیں -''

ڈاکٹر صاحب نے منشی محمد الدین فوق کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا ''جی تو یہی چاہتا ہے کہ کہوں کہ میرے دوستوں کے پاؤں میں گھنگرو باندھیے تو میں گاؤں - لیکن مہاراجہ کے احترام نے شوخی کا منہ بند کر دیا ہے -'' اس کے بعد پانچ سات

شعر ترنم ہی سے پڑھے۔ آپ کے بعد مہاراجہ نے خود بھی فارسی کے چند شعر سنائے۔ پھر کہا: "ڈاکٹری میں آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "میں تو فلسفے کا ڈاکٹر ہوں۔ فزیشن و سرجن ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: "سرکار! یہ بھی آپ کی رعایا ہیں۔"

مہاراجہ نے پوچھا: "وہ کیسے؟ یہ لاہور کے رہنے والے ہماری رعایا کس طرح ہو گئے؟"

ساتھی نے کہا: "ان کے آباؤ اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کی ذات سپرو ہے۔ پنجاب میں ان کا وطن سیالکوٹ ہے۔"

مہاراجہ: "بہت اچھا۔ ڈاکٹر صاحب! سرکار آپ کو کشمیر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ ضرور آئیں۔"[1]

یہ واقعہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ خود سنایا تھا، مگر وہ مہاراجہ کی دعوت پر کشمیر نہ جا سکے۔

اقبال کشمیریوں کو یہودی تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کے عادات و خصائل اور شکل و شمائل افغانوں سے ملتے جلتے ہیں جو بنی اسرائیلی ہیں۔ اور اس معاملے میں ان کو یہاں تک غلو تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے پاس ایک یادداشت بھیجنی چاہیے جس کا مضمون یہ ہو کہ تم بھی بنی اسرائیلی ہو اور کشمیر کے لوگ بھی۔ ان کو دوہری غلامی سے نجات دلا کر نیکی اور بھلائی کی مستقل یادگار چھوڑ

۱- سرگزشت فوق (قلمی)، ص ۱۲۱ -

جائیے - لیکن وہ کشمیر کے روشن اور درخشندہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے - انھوں نے جب کبھی کہا یہی کہا کہ ایسا زرخیز ملک ، ایسے روشن دماغ اور ذہین و ذکی لوگ اور ایسی صناع و ہوشیار قوم ہمیشہ کے لیے کبھی غلام نہیں رہ سکتی - ان کی امید کا دامن یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر کشمیر کے لوگ بیدار ہوگئے ، ان کو زمانے کا ساتھ دینے کی توفیق ہوئی اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا تو یہ سارے ہندوستان کو بیدار کریں گے اور ان کے راہنما ثابت ہوں گے - چنانچہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ہندوستانی ریاستوں کی چھ کروڑ آبادی میں سب سے پہلے کشمیر کے لوگوں ہی نے جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کی دیکھا دیکھی باقی ریاستوں کی رعایا نے بھی قدیم نظام حکومت بدلوانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے -

اس طرح کشمیری برادری کے تنظیمی اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے ہوئے جب آپ نے دیکھا کہ مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے برادریوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کی اس فریب خوردگی سے ملکی سیاست بری طرح متاثر ہو رہی ہے تو آپ نے کشمیری کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور کہا کہ ایک سچے مسلمان اور محب نوع انسان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے - نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک ہنگامی اور عارضی پہلو ہے - اگر اس کی اتنی ہی کائنات تسلیم کر لی جائے تو مجھے اعتراض نہیں ، لیکن جب اسے انسانی قوت کا مظہرِ اتم سمجھا جاتا اور ارتقائے انسانیت کی آخری اور انتہائی منزل قرار دیا جاتا ہے تو مجھے اس کے بدترین لعنت قرار

دینے میں مطلق تامل نہیں ہوتا - چنانچہ ۲۸ اور ۲۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو جب آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا بارھواں سالانہ اجلاس سیالکوٹ میں منعقد ہوا تو آپ اس میں شامل نہ ہوئے - معمولی سا ایک پیغام لکھ کر سیکریٹری استقبالیہ کمیٹی کے نام بھیج دیا اور معذرت طلب کرلی - اس پیغام کو عام کھلے اجلاس میں پیش کرتے ہوئے حاجی میر شمس الدین مرحوم نے کہا :

''آج میں نہایت خوشی سے ایک ایسی ہستی کا پیغام سناتا ہوں جو ہماری برادری میں ارفع و اعلیٰ ہے اور جس پر ہم سب کو ناز ہے - جب یہ بات ہے تو جہاں انہوں نے جنم لیا ان کو خاص طور پر فخر ہونا چاہیے - سر اقبال کو ہماری اس کانفرنس کے ساتھ عرصے سے اختلاف رہا ہے - ان کا خیال تھا کہ ایسی انجمنیں جن کا تعلق برادریوں کے ساتھ ہو نقصان دہ ہیں - ہم نے بارہا ان سے اس بارے میں گفتگو کی ، متعدد دلائل پیش کیے اور یہ بات ان پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ بقیہ مسلمانوں سے علیحدہ رہیں بلکہ ہمارا مقصد خود اپنی اور اپنے بھائیوں کی اصلاح و فلاح اور بہبود کا کام ایک محدود دائرے کے اندر رہ کر کرنا ہے اور اس کا نتیجہ جلد اچھا برآمد ہونا یقینی ہے - مثلاً سب سے پہلے میں اپنے گھر کی اور اپنے محلے کی اصلاح کرنا چاہوں گا تو آسانی سے کرسکوں گا ، بجائے اس کے کہ سارے شہر کی اصلاح کا کام شروع کر دوں - الحمد للہ کہ ڈاکٹر صاحب نے مان لیا ہے اور آئندہ کانفرنس کے کاموں میں دلچسپی لینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے - چنانچہ آپ فرماتے

ہیں کہ "میں کانفرنس کے ہر ایک معاملے میں ہم خیال ہوں اور کانفرنس کے کاموں میں شامل ہو کر عملی طور پر حصہ لینے کی کوشش کروں گا ، میں ہر ممکن اعانت کو تیار ہوں ۔ خدا مجھے اپنی قوم کے نیک کاموں میں حصہ لینے کی توفیق عطا کرے ۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہو سکوں لیکن افسوس کہ انھی تاریخوں پر مجھے شملہ ایک ضروری کام ہے ۔ میری دلی دعائیں کانفرنس کی کامیابی کے لیے وقف ہیں ۔"[۱]

(مجلۂ اقبال لاہور ، اپریل ۱۹۵۶ء)

● ● ●

۱۔ روئداد مسلم کشمیری کانفرنس ۱۹۲۸ء ، ص ۲۷ - ۲۸ -

اقبال کا تعلیمی سفر

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف ۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ع میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے، جہاں سے ۱۸۹۷ع میں بی ۔ اے ۔ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے ایم ۔ اے ۔ فلسفہ میں داخلہ لیا ۔ لیکن اس تعلیمی سفر کی بعض اتفاقی ناکامیاں ان کی آئندہ ترقی کا سبب بن گئیں ۔

دسمبر ۱۸۹۸ع میں انھوں نے ایم ۔ اے کے امتحان کی تیاری کے ساتھ قانون کا ابتدائی امتحان .P.E.L دیا لیکن اس کے فقہ (جورس پروڈنس) کے پرچے میں کامیاب نہ ہوسکے ۔ مارچ ۱۸۹۹ع میں انھوں نے ایم ۔ اے ۔ فلسفہ کا امتحان دیا اور اس میں تیسرے درجے میں کامیاب ہو کر ۱۳ مئی ۱۸۹۹ع کو یونی ورسٹی اوریئنٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوگئے ۔ یہ وظیفہ صرف دو سال کے لیے تھا ۔ ۱۹۰۰ع میں انھوں نے پی ۔ ای ۔ ایل ۔ کا دوبارہ امتحان دینے کی درخواست کی مگر ضابطے کی بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اجازت نہ ملی ۔

اوریئنٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاستِ مدن پڑھانا اقبال کے فرائض میں داخل تھا ۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہوگئے ۔ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں بھی کام کیا ۔ جس طرح وہ طالب علمی کے زمانے میں سعادت مند، ذہین اور محنتی تھے، اسی طرح استاد کی حیثیت سے بھی ایک شفیق اور مہربان استاد ثابت ہوئے مگر اس

سے آپ مطمئن نہ تھے - آگے بڑھنے کے لیے پخت وپز کر رہے تھے -

معلم کی حیثیت سے آپ نے ۱۹۰۰ع میں سیاستِ مدن پر ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی - یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر اردو زبان میں لکھی گئی اور اس میں اولیت کا شرف اقبال ہی کو حاصل ہے - انھوں نے جو راہ ہموار کر دی تھی، اس پر گامزن ہونا بعد کے مصنفین کے لیے چنداں مشکل نہ تھا - اس کتاب میں اقبال نے توضیح اصول کے ساتھ ہندوستان کے تمدنی، اخلاق اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں، جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اس کو مسائلِ اقتصاد پر آزادانہ غور و فکر کی تحریک ہوتی ہے - زرِ نقد کی ماہیت پر جو کچھ لکھا ہے، ایک خاص منطقیانہ دلچسپی رکھتا ہے جس سے عقلی مسرت حاصل ہونے کے علاوہ بعض اہم مسائل پر نہایت گہری روشنی پڑتی ہے -

۱۹۰۱ع میں اقبال ای - اے - سی (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے مگر طبی معائنہ کے وقت غالباً نظر کی کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹروں نے ان کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا - اس پر ستمبر ۱۹۰۱ع کی کسی اشاعت میں "پیسہ اخبار" نے اور اکتوبر ۱۹۰۱ع کے "کشمیری گزٹ" میں منشی محمد الدین فوق نے میڈیکل بورڈ کے خلاف نہایت زوردار مضامین لکھے - ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"پنجاب کے امتحانِ مقابلہ میں ایک کشمیری مسلمان"

"بزرگانِ قوم سے مخفی نہیں کہ قوم میں کیسے کیسے لائق اور ہونہار نوجوان موجود ہیں جن سے قوم کو فخرِ قوم ہونے کی توقع اور امید ہے - منجملہ اور بہت سے نوجوانوں کے اس وقت شیخ محمد اقبال ایم - اے، جو اپنی بے نظیر

لیاقتوں کے باعث چند ہی دنوں میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں، پنجاب کے امتحانِ مقابلہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر میں شامل ہوئے تھے۔ اس مقابلے کے امتحان میں وہ چیز جس سے باوجود دل سوزی، قابلیت اور علمیت کے ناکامی کا نہایت ہی خطرہ ہوتا ہے، یہ ہے کہ امتحان سے ایک روز قبل میڈیکل بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے اور جس کی صحت میں اسے شک ہوتا ہے اسے امتحان کے ناقابل قرار دے کر امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیتا ہے۔ امسال بھی دو امیدوار ایک ہندو اور ایک مسلمان (محمد اقبال ایم۔ اے) اس طبی معائنہ کی نذر ہوئے ہیں۔"[۱]

اس ناکامی نے اقبال کو آگے بڑھنے کے لیے اور اکسایا اور ان کے دل میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ پنجاب یونی ورسٹی کے رجسٹرار اور اورینٹل کالج لاہور میں سنسکرت کے پروفیسر ڈاکٹر الفریڈ سٹریٹن[۲] کی وفات (۱۹۰۳ع) پر مسز سٹریٹن کے نام تعزیتی خط میں وہ امریکی یونی ورسٹیوں میں داخلے کے کوائف اور ممکنات پر غور کرتے نظر آتے ہیں۔[۳]

۱۹۰۴ع میں اقبال کے فلسفے کے استاد پروفیسر طامس آرنلڈ ملازمت سے استعفیٰ دے کر انگلستان روانہ ہو گئے۔ ان کی جدائی سے یہ جذبہ اور بھی شدت اختیار کر گیا اور اقبال نے اپنی مشہور

۱۔ کشمیری گزٹ لاہور، اکتوبر ۱۹۰۱ع۔

۲۔ Dr. A. W. Stratton

۳۔ مجلہ اقبال لاہور، اپریل ۱۹۶۲ع۔

نظم ''نالۂ فراق'' (آرنلڈ کی یاد میں) میں اس کا اظہار یوں کیا:

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئنہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اندکے باغنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

انھی دنوں اقبال کے دوست شیخ عبدالقادر مدیرِ 'مخزن' اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ اس کے بعد تو اقبال پوری سنجیدگی سے ولایت جانے کے منصوبے باندھنے لگے۔ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے تعلیمی مصارف برداشت کرنے کی ہامی بھر کر یہ مشکل آسان کردی اور اقبال ۱۹۰۵ع کی تعطیلات گرما کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے تین سال کی رخصت لے کر تکمیل علوم و فنون کی غرض سے یکم ستمبر ۱۹۰۵ع کو دہلی اور بمبئی کے

راستے عازمِ انگلستان ہو گئے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر کئی دوست اور عزیز الوداع کہنے کو موجود تھے۔ شیخ محمد اکرام مرحوم معاون مدیر 'مخزن' و 'انیسِ نسواں' دہلی، لاہور سے اور میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم انبالہ سے اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے دلی تک گئے۔ میر نیرنگ نے اس موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے اپنے جو تاثرات قلم بند کیے تھے وہ اکتوبر ۱۹۰۵ع کے 'مخزن' میں شائع ہو چکے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ لاہور سے روانہ ہو کر دہلی پہنچے تو خواجہ حسن نظامی، منشی نذر محمد انسپکٹر مدارس دہلی اور چند دیگر احباب دہلی ریلوے اسٹیشن پر استقبال کو موجود تھے۔ ریل سے اتر کر پہلے منشی نذر محمد کے مکان پر، جو اسٹیشن کے قریب تھا، کچھ دیر آرام کیا۔ پھر ناشتے کے بعد سب مل کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ العزیز کی درگاہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت کی۔ آستانۂ حضرت محبوب الٰہی پر پہنچ کر اقبال تنہائی میں مزار کے سرہانے بیٹھ گئے اور آپ نے مندرجہ ذیل نظم اپنی خالص لے میں پڑھی:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق
دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ دہر کی صورت نظام ہے تیرا
کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال
مریدِ پیرِ نجف ہے، غلام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم گلِ بہارِ توام

کیا ہے تیرے مقدر نے مدح خواں مجھ کو
کہے ہزار مبارک مری زباں مجھ کو
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو
مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بیکراں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگارخانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
رہوں میں خادمِ خلقِ خدا جیوں جب تک
نہیں ہے آرزوئے عمرِ جاوداں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

یونہی بنی رہے محفل مرے احبا کی
ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو
قسم ہے اپنے دلِ دردمند کی آقا
تری ثنا کے لیے حق نے دی زباں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

دوستوں کی فرمائش پر یہی نظم درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر نہایت درد انگیز اور دلنشیں لہجے میں ایک دفعہ پھر سنائی گئی - یہ نظم ''بانگِ درا'' میں 'التجائے مسافر' کے عنوان سے موجود ہے مگر اس کے کئی شعر کاٹ دیے گئے ہیں اور چند اشعار کا اضافہ بھی ہوا ہے -

۲ ستمبر کو اقبال دہلی سے رخصت ہو کر بمبئی پہنچے ، جہاں سے ملوجا جہاز میں سوار ہو کر لندن چلے گئے - آپ نے اپنے عزیز دوست مولوی انشاء اللہ خاں مدیر 'اخبار وطن' لاہور کو ایک خط عدن سے اور دوسرا کیمبرج سے اپنے سفر کی روئداد کے طور پر اشاعت کے لیے بھیجا - دونوں خط 'اخبار وطن' کی مختلف اشاعتوں میں مکمل طور پر شائع ہوئے - منشی محمد الدین فوق مدیر 'کشمیری میگزین' بھی اقبال کے جگری دوست تھے - انھوں نے بھی ان خطوں کے کچھ حصے اپنے پرچے میں شائع کیے - ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن سے جو مفصل خط لکھا گیا وہ اس سفر کی یاد تازہ کرنے کے لیے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے - اس میں راستے کی دلچسپ کیفیت بیان کی گئی ہے - شگفتہ اور بے تکلف انداز سونے پر سہاگہ ہے :

''مخدوم و مکرم مولوی صاحب ! السلام علیکم

آپ سے رخصت ہو کر اسلامی شان و شوکت کے اس

قبرستان میں پہنچا جس کو دہلی کہتے ہیں - ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی[1] اور شیخ نذر محمد[2] صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے - تھوڑی دیر کے لیے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا - بعد ازاں حضرت محبوب الٰہی[3] کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کیا -

اللہ اللہ حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے - بس یہ سمجھ لیجیے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے - خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں - شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے - خواجہ صاحب موصوف

۱- ولادت ۱۸۷۶ع - وفات ۱۹۵۵ع -

۲- منشی نذر محمد خلف مولوی غلام رسول خطاط گوجرانوالہ کی کشمیری برادری سے تعلق رکھتے اور اقبال کے دوست تھے - ۱۸۸۹ع میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی - اے کرنے کے بعد محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوئے - پہلے کافی عرصہ ہیڈ ماسٹر اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز رہے اور آخر میں انسپکٹر آف سکول پنجاب کے عہدے سے سبکدوش ہوئے - عمر میں اقبال سے بڑے تھے مگر اپنا کلام اقبال کو دکھاتے تھے - اقبال کی وفات کے تقریباً چار سال بعد ۹ فروری ۱۹۴۲ع کو اپنے مکان نذر منزل واقع رام بستی گوجرانوالہ کی چھت سے گر کر جاں بحق ہوئے -

۳- خواجہ نظام الدین اولیاء -

ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی ۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا ۔ اس ظالم نے مرزا کے مزار کے قریب بیٹھ کر :

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں ۔ بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہوسکا ۔ آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا ۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے ۔

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا ۔ شہنشاہ ہمایوں[1] کے مقبرے پر فاتحہ پڑھی ۔ دارا شکوہ[2] کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ''ھوالموجود'' کی آواز سنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا ۔

۱۔ شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں (۱۵۰۸ع — ۱۵۵۶ع) ۔
۲۔ دارا شکوہ (۱۶۱۵ع — ۱۶۵۸ع) شاہجہان کا سب سے بڑا بیٹا ، کئی کتابوں کا مصنف ۔

۴ ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ہم کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل میں پہنچا ۔ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں مگر میں نے ٹامس کک[1] کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربے سے معلوم کیا کہ یہ ہوٹل ہندوستانی طلباء کے لیے جو ولایت جا رہے ہوں نہایت موزوں ہے ۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے ، گھاٹ یہاں سے قریب ہیں ، ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب ۔ غرض کہ ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے ۔ صرف تین روپیہ یومیہ دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کر لو ۔ یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آ جاتے ہیں ۔ دکان داری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علماء میں باوجود عبادت اور مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا ۔ کار لائل[2] نے کیا خوب کہا ہے کہ :

"محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے ۔"

میرے دل پر اس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی

۱۔ بحری جہازوں کی ایجنسی ۔

۲۔ تھامس کارلائل (۱۷۹۵ء — ۱۸۸۱ء) مشہور انگریز مورخ ، مفکر ، انشا پرداز ۔

تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں - لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازے سے زیادہ ہو گئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے - میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا - اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی - جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب! ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اس کا شوق کرو - ذرا مسکرایا اور کچھ پیے ہوئے بھی تھا، بولا:

ع ''سراب سوک پینے سے سبھی گم دور ہو جائے''

(پارسی بڈھے نے اس مصرع میں 'شراب شوق' اور 'غم' کی مٹی پلید کی ہے) میں نے سن کر کہا: واہ رے بڈھے! خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہو کر بمبئی کی کھیت باڑی میں پکتا پھرے -

اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آ کر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا - میں نے ایک روز اس سے پوچھا ''تم کہاں سے آئے ہو؟'' بولا ''چین سے آیا ہوں، اب ٹرانسوال[1] جاؤں گا -'' میں نے پوچھا ''چین میں تم

۱- جنوبی افریقہ کا ایک صوبہ، جو لوہے، تانبے، سیسے، کوئلے، سونے اور ہیرے کی کانوں کی وجہ سے مشہور ہے -

کیا کام کرتے تھے ؟" کہنے لگا "سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے -" میں نے سن کر دل میں کہا ، ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقل مند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں - شاباش افیمیو ، شاباش ! نیند سے بیدار ہو جاؤ - ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے -[1] ہاں ہم ہندوستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سر نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے - ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے - ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بُو باقی نہیں رہی - ہم اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمانوں کی جان کا دشمن ہو - ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں - کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں - مولوی صاحب ! میں بے اختیار ہوں - لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے - کیا کروں ، اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کردیا اور کر رہا ہے -

ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے - شکل سے معلوم ہوتا تھا

۱- گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
(بال جبریل ، ص ۱۲۴)

کہ یورپین ہیں ۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے ۔ آخر جب کھانا کھا کر اٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی ، جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے ۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان سے ملاقات ہو ۔ دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں ۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا ۔ میں نے پوچھا ''فارسی جانتے ہو ؟'' بولا ''بہت کم ۔'' پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی لیکن وہ نہ سمجھتا تھا ۔ آخر بمجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں ۔

یہ نوجوان ترک ''ینگ ٹرک[1] پارٹی'' سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید[2] کا سخت مخالف ہے ۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے ۔ میں نے درخواست

۱۔ ترکی کے جلاوطنوں کی ایک جماعت نے ۱۸۹۱ء میں جنیوا میں انجمن اتحاد و ترقی قائم کی اور سلطان پر زور ڈالا کہ اصلاحات نافذ کرے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو ترکی میں دستوری حکومت قائم ہوگئی مگر نوجوانوں کی جد و جہد پھر بھی جاری رہی ۔ آخر ۱۹۲۴ء میں خلافت ہی کا خاتمہ ہوگیا ۔

۲۔ سلطان عبدالحمید ثانی خلافت عثمانیہ کا آخری حکمران ۱۸۷۶ء میں خلافت کی گدی پر بیٹھا ۔ اس کے عہد میں نوجوان ترکوں کی تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ سلطان کو مجبوراً اصلاحات نافذ کرنی پڑیں ۔ برسراقتدار آنے پر نوجوان ترکوں نے سلطان کو معزول کرکے سالونیکا میں نظربند کر دیا جہاں وہ ۱۹۱۸ء میں انتقال کر گیا ۔
(حاشیہ خطوط اقبال ، ص ۸۲)

کی کہ اپنے شعر سناؤ - کہنے لگا ''میں کمال بے (ترکی کا سب سے بڑا زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں -'' کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے سب کے سب نہایت عمدہ تھے - جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے - ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں :

ظلم و جورن تو سفوجہ بر ماتے محو ایلیور
آدمیت ملک و ملت دشمن عبدالحمید

(یعنی کبیر ظلم و جور نے تمام قوم کو مٹا دیا ہے - عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے) -

اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ جس طریق سے رعایائے انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کیے ہیں ، وہ طریق سب سے عمدہ ہے - بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت و خون کے ہو جانا یہ کچھ خاکِ انگلستان ہی کا حصہ ہے -

ایک روز سرِ شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے - وہاں اسکول کی گراؤنڈ میں مسلمان طلبا کرکٹ کھیل رہے تھے - ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں اس سے دریافت کیں - میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی - کیا فنڈ

نہیں ہے یا اور کوئی وجہ ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے ، کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں ، مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبا پڑھنے کے لیے نہیں آتے ہیں ۔ اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم ان میں ہوتی ہے ویسی سردست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے ۔ یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا ۔ میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہو گا کیونکہ یہاں کے مسلمان تموّل میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں ، لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ تموّل کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے ۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں ۔ ہر چیز کو تجارتی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں ۔

غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے ۔ بازار کشادہ ، ہر طرف پختہ سربفلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ ان سے خیرہ ہوتی ہے ۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے ۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے ۔ یورپ ، امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو ، فوراً ملے گی ۔ ہاں البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں نہیں مل سکتی ۔ یعنی فراغت ۔

یہاں پارسیوں کی آبادی اسی نوے ہزار کے قریب ہے ۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے - اس قوم کی صلاحیت نہایت قابل تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ ، مگر اس قوم کے لیے کسی اچھے فیوچر (Future) کی پیش گوئی نہیں کر سکتا - یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے - علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے - اور طرہ یہ کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - افسوس ! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ و ریشہ میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دار و مدار ہے - میں نے سکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا ، چستی کی سورتیں تھیں - مگر تعجب ہے کہ ان کی خوبصورت آنکھیں اسی فیصد کے حساب سے عینک پوش تھیں - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے - معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے - اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے - ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا - گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا -

نوروجی دادا بھائی[1] کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے؟ بولا ”حجور! کالوں کے لیے لڑتا ہے۔“

ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھا ”تم اردو پڑھ سکتے ہو؟“ کہنے لگے ”نہیں، سمجھ سکتے ہیں، پڑھنا نہیں جانتے۔“ میں نے پوچھا کہ جب مولوی تمھارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے؟ مسکرا کر بولا ”اردو!“ یہاں پر ہر کوئی اردو سمجھ سکتا ہے اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (وہی بوتل والا پیر مرد) کبھی ہندوستان نہیں گیا مگر اردو خاصی بولتا تھا۔

میں بمبئی یعنی بابِ لنڈن کی کیفیت دیکھ کر حیران ہوں۔ خدا جانے لنڈن کیا ہوگا جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے۔ اچھا دیدہ خواہد شد۔ ۷ ستمبر کو دو بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (گھاٹ) پر پہنچے جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر! یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سینکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈر۔ خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح و سلامت

۱۔ دادا بھائی نوروجی (۱۸۲۵ع — ۱۹۱۷ع) بمبئی کے معروف پارسی رہنما جو ۱۸۹۲ع میں برطانوی دارالعوام کے ممبر ہوئے اور طویل عرصے تک انگلستان میں مقیم رہے۔

منزلِ مقصود پر پہنچا دیں گے - خیر طبی معائنے کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا - لالہ دھنپت رام وکیل لاہور اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اس روز حسنِ اتفاق سے بمبئی میں تھے - میں ان کا نہایت سپاس گزار ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لیے ڈاک پر تشریف لائے - بہت سے اور لوگ بھی جہاز پر سوار ہوئے اور ان کے دوستوں اور رشتے داروں کا ایک ہجوم ڈاک پر تھا - کوئی تین بجے جہاز نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے - یہاں تک کہ موجیں ادھر اُدھر سے آ کر ہمارے جہاز کو چومنے لگیں - فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے - ہر روز صبح کو کئی آدمی جہاز کی صفائی میں مصروف ہوتے ہیں اور ایسی خوبی سے صفائی کرتے ہیں کہ ایک تنکا تک جہاز پر نہیں رہنے دیتے - ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں - جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آ جاتا ہے - ایک روز ایک افسر تختۂ جہاز پر کھڑا تھا کہ ایک حسین عورت کا ادھر سے گزر ہوا - اتفاق سے یا غالباً ارادتاً یہ عورت اس افسر کے شانے پر ہاتھ رکھتی ہوئی گزری - ہمارے نوجوان افسر نے اس توجہ کے جواب میں ایک ایسی ادا سے جنبش کی کہ ہمارے ملک کے حسین بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے -

کھانے کا انتظام بھی نہایت قابل تعریف ہے - میز بھی

فرانسیسی تکلف کی گواہی دے رہا ہے - مگر اس جہاز پر ہم ہندوستانیوں کے لیے ایک بڑی دقّت ہے اور وہ یہ کہ جہاز کے تقریباً سب مسافر فرانسیسی بولتے ہیں ، انگریزی کوئی نہیں بولتا - جہاز کے تمام ملازم فرانسیسی بولتے ہیں اور بعض اوقات ان کو اپنا مطلب سمجھانے میں بڑی دقّت ہوتی ہے - اگرچہ فرانسیسی جہازوں میں ہر طرح کی آسائش ہے ، تاہم میری رائے یہی ہے کہ ہم لوگوں کو انگریزی کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کرنا چاہیے - ان کے مسافر سب کے سب انگریزی داں ہوتے ہیں اور علاوہ اس کے مسافروں کی کثرت کی وجہ سے جہاز پر بڑی رونق ہوتی ہے - ہمارے اس جہاز میں ساٹھ سے زیادہ مسافر نہیں ہیں -

ہم لوگ رات کو اپنے اپنے کمروں میں سوتے ہیں اور صبح سے شام تک تختۂ جہاز پر کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے ہیں - کوئی پڑھتا ہے ، کوئی باتیں کرتا ہے ، کوئی پھرتا ہے - کیبن میں جہاز کی جنبش کی وجہ سے طبیعت بہت گھبراتی ہے مگر تختۂ جہاز پر بہت آرام رہتا ہے - میرے تمام ساتھی دوسرے ہی روز "مرضِ بحری" میں مبتلا ہو گئے مگر الحمدللہ کہ میں محفوظ رہا - مجھ سے اکثروں نے دریافت کیا "کیا تم نے کبھی پہلے بھی سفر کیا ہے ؟" جب میں نے جواب دیا کہ نہیں ، تو وہ حیران ہوئے اور کہا کہ تم بڑے مضبوط آدمی ہو -

بمبئی سے ذرا آگے نکل کر سمندر کی حالت کسی قدر متلاطم تھی - خواجہ خضر صاحب کچھ خفا سے معلوم

ہوتے تھے - اتنی اتنی اونچی موجیں آتی تھیں کہ خدا کی پناہ ! دیکھ کر دہشت آتی تھی - ایک شب ہم کھانا کھا کر تختۂ جہاز پر آ بیٹھے - کچھ عرصے کے بعد سمندر کی سرد ہوا نے ہم سب کو سلا دیا - مگر دفعتہً ایک خوف ناک موج نے اچھل کر ہم پر حملہ کر دیا اور تمام مسافروں کے کپڑے بھیگ گئے - عورتیں ، بچے اور مرد نیچے بھاگ کر اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے جہاز کے ملازموں اور افسروں کے تمسخر کا باعث بنے رہے - رستے میں ایک آدھ بارش بھی ہوئی جس سے سمندر کا تلاطم نسبتاً بڑھ گیا اور طبیعت اس نظارے کی یکسانیت سے اکتانے لگی - سمندر کا پانی بالکل سیاہ معلوم ہوتا ہے اور موجیں ، جو زور سے اٹھتی ہیں ، ان کو سفید جھاگ چاندی کی ایک قلغی سی پہنا دیتی ہے اور دور دور تک ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے سطح سمندر پر روئی کے گالے بکھیر ڈالے ہیں - یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے ، اگر اس میں موجوں کی دہشت ناک کشا کش کی آمیزش نہ ہو - ان کی قوت سے جہاز ایک معمولی کشتی کی طرح جنبش کرتا ہے - آسمان اوپر تلے ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ اس نظارے سے آنکھیں کسی قدر مانوس ہو گئی ہیں —— اور نیز جہاز والوں کے چہروں کا اطمینان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک معمولی بات ہے —— اس واسطے ہم کو بھی خوف کا احساس نہیں ہوتا - یورپین لڑکے لڑکیاں تختۂ جہاز پر دوڑتے پھرتے ہیں اور یہ محسوس بھی نہیں کرتے کہ جہاز میں ہیں -

ہمارا ہم سفر ایک پادری ہے جو جنوبی ہندوستان سے آیا ہے اور اب اٹلی کو جا رہا ہے ۔ گزشتہ رات مجھ سے کسی نے کہا کہ یہ فرانسیسی پادری بہت سی زبانیں جانتا ہے اور روسی زبان خوب بولتا ہے ۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی[1] کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے ؟ اس نے میرے سوال پر بہت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کون شخص ہے ؟ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے ۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ تختۂ جہاز پر دیا سلائی استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے ۔ تختۂ جہاز کے ایک طرف ایک کمرے کی دیوار پر پیتل کی ایک انگیٹھی سی لگا رکھی ہے ، جس میں چند لکڑیاں آگ لگا کر رکھ دیتے ہیں ۔ جن لوگوں کو سگریٹ یا سگار دودی کرنا ہو ، اس انگیٹھی سے ایک لکڑی اٹھا لیں ۔

جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے ۔ باری تعالیٰ کی قوتِ لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے ، شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو ۔ حجِ بیت اللہ میں تمدنی اور روحانی فوائد ہیں ، ان سے قطع نظر کرکے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا

۱- روسی ناول نگار (۱۸۲۸ — ۱۹۰۰ء) ۔

ہے ، جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے - شارعِ اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے -

بابی انت وآمی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

آج ۱۲ ستمبر کی صبح ہے - میں بہت سویرے اٹھا ہوں - جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں - چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے - آفتاب چشمۂ آب میں سے اٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسے ہمارا دریائے راوی - شاید صبح کے پُر تاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا کہ سکونِ قلب بھی ایک نایاب شے ہے - ہر وقت کی الجھن اور بے تابی اچھی نہیں - طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے - یہی آفتاب ہے جس کے طلوع و غروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ :

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

حقیقت میں جن لوگوں نے آفتاب پرستی کو اپنا مذہب قرار دے رکھا ہے ، میں ان کو قابلِ معذوری سمجھتا ہوں - ناسخ مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں :

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے
تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

کوئٹے کے ڈپٹی کمشنر صاحب جو اٹھارہ ماہ کی رخصت لے کر ولایت جا رہے ہیں اور وہ پادری صاحب جو ٹالسٹائی کے نام سے ناواقف معلوم ہوتے تھے ، اس وقت جہاز کی

اوپر کی چھت پر کھڑے اس نظارے کا لطف اٹھا رہے ہیں - یہ پادری صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں - ان میں ایک خاص ہنر ہے اور وہ یہ کہ ہر کسی کو باتوں میں لگا لیتے ہیں - انگریزی بولتے ہیں مگر بہت شکستہ اور مجھ کو جب بلاتے ہیں تو ٹالسٹائی کے نام سے - کل مجھ سے پوچھتے تھے تم ہندوستان کا ٹالسٹائی بننا چاہتے ہو ؟ میں نے جواب دیا ٹالسٹائی بن جانا آسان نہیں ہے - زمین سورج کے گرد لاکھوں چکر لگاتی ہے تب جا کے کہیں ایک ٹالسٹائی پیدا ہوتا ہے - کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے باخبر آدمی معلوم ہوتے ہیں - کل رات ان سے ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی - عربی اور فارسی جانتے ہیں - سر ولیم میور[1] کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی تو کہنے لگے ''کاش یہ شخص ذرا کم متعصّب ہوتا -'' عمر خیام[2] کے بڑے مداح ہیں مگر میں نے ان سے کہا کہ اہل یورپ نے ابھی سحابی نجفی[3] کی رباعیات کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ عمر خیام کو کبھی کے فراموش کر گئے ہوتے -

اب ساحل قریب آتا جاتا ہے - چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا - ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق و

۱- صوبہ الہ آباد کے لفٹننٹ گورنر جن کی زہریلی کتاب ''لائف آف محمد'' کے جواب میں سرسید کو ''خطبات احمدیہ'' لکھنی پڑی -

۲- حکیم عمر خیام نیشاپوری : م ۱۱۲۲ع -

۳- ابو سعید سحابی استرآبادی : م ۱۶۰۱ع - چالیس برس نجف اشرف میں گزارنے کی وجہ سے نجفی کہلاتے ہیں -

شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے ، اس کی داستان کیا عرض کروں ۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں :

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین ! تجھ کو مبارک ہو ۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی ۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی ۔ آہ ! اے پاک سرزمین ! تو وہ جگہ ہے جہاں باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے ۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے ۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو ۔ کاش ! میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا

ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں
اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی ۔''

از عدن — راقم

مورخہ ۱۲ ستمبر (۱۹۰۵ع) — محمد اقبال

اس خط نے خاصی دلچسپی پیدا کی اور دوست دوسرے خط کا نہایت بے تابی سے انتظار کرنے لگے ۔ مگر اس میں کچھ تعویق ہو گئی ۔ اقبال انگلستان پہنچ کر اپنے داخلے وغیرہ کے ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے ۔ جب ادھر سے تقاضا ہوا تو آپ نے ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ع کو کیمبرج سے دوسرا خط لکھا ، جو پہلے خط سے کسی قدر مختصر تو ہے مگر نہایت معلومات افزا ہے اور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

''مولوی صاحب مخدوم و مکرم ! السلام علیکم

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ سویز پہنچ کر دوسرا خط لکھوں گا مگر چونکہ عدن سے سویز تک کے حالات بہت مختصر تھے ، اس واسطے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ لندن پہنچ کر مفصل واقعات عرض کروں گا ۔ میرے پاس ایک کاغذ تھا جس پر میں نوٹ لیتا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ کر وہ کاغذ کہیں کھو گیا ۔ یہی وجہ میرے اب تک خاموش رہنے کی تھی ۔ شیخ عبدالقادر[1] صاحب کی معرفت آپ کی شکایت پہنچی ۔ کل ایک پرائیویٹ خط میں نے آپ کو لکھا تھا ۔ دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت ملیں گے ۔

۱۔ مدیر مخزن ، لاہور (۱۸۷۴ — ۱۹۵۰ع) ۔

عدن میں قدیم ایرانی بادشاہوں کے بنائے ہوئے تالاب ہیں اور یہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک دفعہ بارش کا تمام پانی ہر جگہ سے ڈھل کر ان میں جا گرتا ہے۔ چونکہ ملک خشک ہے اس واسطے ایسی تعمیر کی سخت ضرورت تھی۔ میں بوجہ گرمی کے اور نیز قرنطینہ کے عدن کی سیر نہ کر سکا۔ انجنئیری کے اس حیرت ناک کرشمے کی نگارش سے محروم رہا۔ جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آموجود ہوئی اور ایک قسم کا بازار تختہ جہاز پر لگ گیا۔ ان لوگوں کی فطرت میں میلان تجارت مرکوز ہے اور کیوں نہ ہو، ان ہی کے آبا واجداد تھے جن کے ہاتھوں میں کبھی یورپ اور ایشیا کی تجارت تھی۔ سلیمان اعظم[1] انھیں میں کا ایک شہنشاہ تھا جس کی وسعت تجارت نے اقوام یورپ کو ڈرا کر ہندوستان کی ایک نئی راہ دریافت کرنے کی تحریک کی تھی۔

کوئی پھل بیچتا ہے، کوئی پوسٹ کارڈ دکھاتا ہے، کوئی مصر کے پرانے بت بیچتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ ذرا سا بت اٹھارہ ہزار برس کا ہے جو ابھی کھنڈر کھودنے پر ملا ہے۔ غرض کہ یہ لوگ گاہکوں کو قید کر لینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ انھیں

۱۔ سلیمان اول (۱۵۱۷ — ۱۵۶۶ع) کے عہد میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کا چالیس ہزار مربع میل رقبہ سلطنت عثمانیہ کے زیرنگیں تھا۔ اسی کے امیرالبحر خیرالدین باربروسا نے ۱۵۲۰ع میں یورپ کے عیسائی بیڑے کو شکست دی تھی۔

لوگوں میں ایک شعبدہ باز بھی ہے کہ ایک مرغی کا بچہ ہاتھ میں لیے ہے اور کسی نامعلوم ترکیب سے ایک کے دو بنا کر دکھاتا ہے۔ ایک نوجوان مصری دکاندار سے میں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں، میں نے اس سے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا تھا۔ جب وہ میرے اسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا: ''تم بھی مسلم ہم بھی مسلم'' تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی داڑھی منڈی ہو تو اس کو ترکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی۔ میں نے دل میں کہا کہ کاش ہمارے ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ مروج ہو جاتا تاکہ ہمارے دوست موسمی علما کے حملوں سے مامون و مصئون ہو جاتے۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظ قرآن تھا اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ باقی تمام دکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہنے لگے، اور میری غرضِ سفر معلوم کرکے دعائیں دینے لگے، یا یوں کہیے کہ دو چار منٹ کے لیے وہ تجارت کی پستی سے ابھر کر اسلامی اخوت کی بلندی

پر جا پہنچے -

تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لیے آیا - میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے علی گڑھ کالج کے ایک ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا - یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور میں بھی دخل در معقولات ان میں جا گھسا - دیر تک باتیں ہوتی رہیں - ان میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری[1] کا کوئی مقالہ پڑھ رہا ہو -

آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کنال میں جا داخل ہوا - یہ کنال ، جسے ایک فرانسیسی انجنیئر نے تعمیر کیا تھا ، دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے - عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے - دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ[2] نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانۂ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے - کسی شاعر کا قلم اور سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیّل کی داد نہیں دے سکتا ، جس نے اقوام عالم میں اس

۱- عربی ادب و انشا کا یہ شاہکار ابو محمد بن علی بن عثمان الحریری البصری (م : ۱۱۱۲ع) کی تصنیف ہے -

۲- مہاتما گوتم بدھ (۵۶۰ - ۴۸۰ ق م) -

۳- مصر کے خدیو سعید پاشا کے زمانے میں اس نہر کی کھدائی ۲۹ اپریل ۱۸۵۹ع کو شروع ہوئی اور ۱۷ نومبر ۱۸۶۹ع کو اس کا افتتاح ہوا -

تجارتی تغیّر کی بنیاد رکھی، جس نے حال کی دنیا کی تہذیب و تمدن کو اور سے کچھ اور کر دیا - بعض بعض جگہ تو یہ کنال ایسی تنگ ہے کہ دو جہاز مشکل سے اس میں گزر سکتے ہیں اور کسی جگہ ایسی بھی ہے کہ اگر کوئی غنیم چاہے کہ رات بھر میں اسے مٹی سے پُر کر دے تو آسانی سے کر سکتا ہے - سینکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں جب ٹھیک رہتی ہے، اور اس کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے، اس کا انتظام ہوتا رہے - کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں، بعض نہایت شریر ہوتے ہیں - جب ہمارا جہاز آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور جہاز کی چند انگریز بیبیاں کھڑی ساحل کی سیر کر رہی تھیں تو ان میں سے ایک مزدور از سرتاپا برہنہ ہو کر ناچنے لگا - یہ بے چاری دوڑ کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں -

سویز سے گزرتے ہوئے ایک اور دلچسپ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا جو بالکل ہمارے ہی پاس سے ہو کر گزرا - اس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے عربی غزل گاتے جاتے تھے - یہ نظارہ ایسا پر اثر تھا کہ اس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے -

ابھی ہم پورٹ سعید نہ پہنچے تھے کہ ایک بارود سے بھرے ہوئے جہاز کے پھٹ جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر غرق ہو جانے کی خبر آئی - تھوڑی دیر میں اس کے

ٹکڑے کنال سے گزرتے ہوئے دکھائی دیے - جان و مال کا بےاندازہ نقصان ہوا اور تھوڑی دیر کے لیے ہماری طبیعت اس مصیبت پر بہت متاثر رہی - پورٹ سعید پہنچ کر پھر مسلمان تاجروں کی دکانیں تختۂ جہاز پر لگ گئیں - میں ایک کشتی پر بیٹھ کر سح پارسی ہم سفر کے بندرگاہ کی سیر کو چلا گیا - پورٹ سعید جہازوں کو کوئلہ مہیا کرنے والے بندرگاہوں میں سب سے بڑا ہے اور سعید پاشا کے نام سے مشہور ہے ، جس نے سویز کنال بنانے کی اجازت دی تھی - عمارات کا نظارہ نہایت ہی خوبصورت ہے اور شہر چھوٹی سی بمبئی ہے جس کی نسبت خیال ہے کہ یہ کبھی دنیا کے تجارتی مرکزوں میں سے ایک ہوگا - مدرسہ دیکھا ، مسجدوں کی سیر کی ، اسلامی گورنر کا مکان دیکھا - موجدِ سویز کنال کا مجسمہ دیکھا ، غرض کہ خوب سیر کی - یہاں کے مدرسے میں عربی اور فرانسیسی پڑھاتے تھے - جس حصے میں انگریز آباد ہیں وہ حصہ خصوصیت سے خوبصورت اور پاکیزہ ہے لیکن افسوس ہے کہ جہاں مسلمان آباد ہیں وہ جگہ بہت میلی ہے - یہودی فرانسیسی ، انگریز ، یونانی ، مسلمان غرضکہ دنیا کی تمام اقوام یہاں آباد ہیں - سب کے محلے جدا جدا ہیں ، ہوٹل بھی جدا جدا ہیں اور چرچ بھی -

شہر کی سیر کرکے پورٹ آفس میں آیا - ملازم قریباً سب مسلمان ہیں اور خوب انگریزی اور عربی بولتے ہیں - اس عمارت میں داخل ہو کر میں نے نوٹس بورڈ سے کئی نئے عربی الفاظ سیکھے جن کو ایک کاغذ پر میں نے نوٹ کر

لیا - لیکن افسوس ہے کہ بعد میں وہ کاغذ بھی کھو گیا - کچھ ٹکٹ پوسٹ آفس سے خرید کیے اور خطوں پر لگا کر ڈاک میں ڈالے - تعجب ہے کہ ان میں سے کسی خط کی رسید نہیں آئی - آخر اپنے مسلمان رہنما کو جو اکثر زبانیں جانتا تھا کچھ انعام دے کر جہاز کو لوٹا - یہاں جو پہنچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا - جہاز پر تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا - ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی ، نہایت حسین تھی - مجھے دیانت داری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حسن نے تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سخت اثر کیا لیکن جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہوگیا - کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن ، جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو ، بدصورتی سے بھی برتر ہو جاتا ہے -

القصہ فردوس گوش اور کسی قدر جنت نگاہ کے حظوظ اٹھا کر ہم روانہ ہوئے اور ہمارا جہاز بحرِ روم میں داخل ہوگیا - یہاں سے بہت سے جزیزے رستے میں ملتے ہیں جن میں سے بعض کسی نہ کسی بات کے لیے مشہور ہیں - لیکن ان کے نظارے کی کیفیت ذہن سے اتر گئی - یہ جتنے سطور لکھے ہیں ، حافظے سے لکھے ہیں - اگر میرے نوٹ ضائع نہ جاتے تو امید ہے کہ میں آپ کے ناظرین کو زیادہ کامیابی کے ساتھ خوش کر سکتا -

بحر روم کے ابتدائی حصے میں سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ

تھا اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے ۔ میری طبیعت قدرتاً شعر کی طرف مائل ہو گئی اور میں نے چند اشعار کی غزل لکھی جو حاضر ہے :

مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں
عجب[1] تماشا ہے مجھ کافر محبت کا
صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں
ہوا[2] جہاں کی ہے پیکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں
نظارہ[3] لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں
رہینِ[4] لذتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں
بھلی ہے ہم نفسو ! اس چمن میں خاموشی
کہ خوش نواؤں کو پابند دام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

---

۱ تا ۴۔ یہ اشعار 'بانگِ درا' کی ترتیب کے وقت غزل سے خارج کر دیے گئے ۔

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں
جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے
نظام[1] دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
ہرے رہو وطنِ مازنی[2] کے میدانو!
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں
جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

(مازنی اٹلی کے محسنین کا سرگروہ تھا ۔ یہ شعر اس وقت لکھا گیا جب کہ اس ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا) ۔ مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے ۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ سمندر کا آخری حصہ بہت متلاطم تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اصلی راستے میں طوفان کا اندیشہ ہوگا ، ہمارا کپتان جہاز کو ایک اور راستے سے لے گیا جو معمولی راستے سے کسی قدر لمبا تھا ۔ ۲۳ کی صبح کو مارسیلز یعنی فرانس کی ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہنچے اور چونکہ ہمیں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا تھا ، اس

۱۔ ایضاً ۔

۲۔ اٹلی کا ایک محب وطن سیاسی رہنما (۱۸۰۵ — ۱۸۷۲ع) ۔

واسطے بندرگاہ کی خوب سیر کی ۔ مارسیلز کا نوٹر ڈام گرجا نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم و فنون کی محرّک ہوتی ہے ۔ مارسیلز سے گاڑی پر سوار ہوئے اور فرانس کی سیر بھی حسنِ رہگزرے کے طریق پر ہو گئی ۔ کھیتیاں جو گاڑی کے ادھر اُدھر آتی ہیں ، ان سے فرانسیسی لوگوں کا نفیس مذاق مترشح ہوتا ہے ۔ ایک رات گاڑی میں کٹی اور دوسری شام ہم لوگ برٹش چنال[1] کو کراس کرکے ڈوور[2] اور ڈوور سے لندن پہنچے ۔ شیخ عبدالقادر کی باریک نگہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے دور سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہو گئے ۔

مکان پر پہنچ کر رات بھر آرام کیا ۔ دوسری صبح سے کام شروع ہوا ، یعنی ان تمام فرائض کا مجموعہ جن کی انجام دہی نے مجھے وطن سے جدا کیا تھا اور میری نگاہ میں ایسا ہی مقدس ہے جیسے عبادت ۔"

از کیمبرج — والسلام

۲۵ نومبر ۱۹۰۵ع — آپ کا محمد اقبال

کیمبرج میں داخلہ :

پروفیسر آرنلڈ کی کوشش سے اقبال کو ٹرینٹی کالج کیمبرج میں آسانی سے داخلہ مل گیا اور قیام و طعام کا بھی خاطر خواہ بندوبست

۱۔ برٹش چینل ۔
۲۔ Dover انگلستان کی ایک بندرگاہ ۔

ہو گیا ۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ مطالعے اور تحقیقی انہماک سے فلسفۂ اخلاق پر ایک مقالہ لکھ کر بی ۔ اے ۔ کی ڈگری حاصل کر لی ۔ یہی کیمبرج یونیورسٹی کا سب سے بڑا امتحان تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال لنکنز اِن لندن میں قانون کا درس بھی لیتے رہے ۔ اقبال کا اپنا بیان ہے کہ ''جب میں ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی ۔ ولایت کے قیام کے دوران میں بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے ۔ جب میں نے کیمبرج سے بی ۔ اے ۔ کر لیا تو انھوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کرکے واپس آ جاؤ ، لیکن میرا ارادہ پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا ، اس لیے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم اور بھیجیے تاکہ جرمنی جا کر ڈاکٹری کی سند لے لوں ۔ انھوں نے مجھ کو مطلوبہ رقم بھیج دی ۔ انھی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ کسی نے پوچھا ۔ ''کیوں شیخ صاحب ! سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے ؟'' بھائی صاحب نے جواب دیا ۔ ''بھئی کیا بتلاؤں ، ابھی تو وہ ڈگریوں پر ڈگریاں لیے جا رہا ہے ۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا اجرا کب ہوگا ؟''[1]

قیام و طعام :

انگلستان میں اقبال کو ذبیحہ اور طہارت کا کتنا خیال تھا ۔ خود فرماتے ہیں کہ ''میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میرے قیام کا انتظام کسی ایسے گھر میں کر دیا جائے جہاں

۱۔ آثار اقبال ، ص ۳۶ ۔

ذبیحہ کا خاص انتظام ہو - یورپ میں صرف یہود ہی اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اپنا ذبیحہ کھائیں - چنانچہ ایک یہودی گھر میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا - ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں - اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے تھے - جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا - میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ میرے بھی پیغمبر ہیں اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں وغیرہ - لیکن کچھ عرصے کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا - یہ لوگ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں ان کے ذریعے منگاتا تھا ، دوکاندار سے کمیشن لیا کرتے تھے - ان کی اسی عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا -

میں جہاں بھی رہتا تھا ، میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا تھا - چند روز اسی طرح گزرے - آخر میری میزبان یعنی مالکۂ مکان (لینڈ لیڈی) سے نہ رہا گیا - (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھی) - مجھ سے پوچھنے لگی ”یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لے جاتے ہو ؟“ میں نے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے - چنانچہ اس پر گفتگو شروع ہوئی - میں نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کیے - مثلاً غسلِ جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طُہر کا غسل - پھر میں نے کہا ”بڑی بی ! کسی خاص غسل کی آپ کو حاجت نہ ہوگی - البتہ طہارت کا پانی ضرور استعمال کیا کیجیے -“ یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئی اور فرمانے لگی کہ

میں ضرور ایسا کروں گی ۔ مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں ۔"

اساتذہ :

کیمبرج اور لندن میں رہ کر اقبال کو پروفیسر میک ٹیگرٹ[1] ، پروفیسر نکلسن ، پروفیسر ای ۔ جی ۔ براؤن ، پروفیسر مارلے ، پروفیسر الیگزنڈر ، پروفیسر وائٹ ہیڈ ، پروفیسر وارڈ اور پروفیسر ڈکنسن سے استفادے کے بے شمار مواقع ملے ۔ پروفیسر میک ٹیگرٹ ہی کی نگرانی میں اقبال نے "ڈویلپمنٹ آف میٹا فزکس ان پرشیا" (ایران میں فلسفہ الٰہیات کا ارتقاء) کے موضوع پر اپنا پی ایچ ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا ۔ اسی مقالے کی تیاری کے دوران اقبال کے ذہن میں مروجہ تصوف اور مسئلۂ وحدت الوجود کے بارے میں کچھ شکوک پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنے دوست خواجہ حسن نظامی کے ذریعے قاری شاہ سلیمان پھلواروی سے بعض الجنھیں دور کرنے کی کوشش کی ۔

پروفیسر میک ٹیگرٹ کیمبرج میں کانٹ اور ہیگل کے فلسفے کے ماہر مانے جاتے تھے اور ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ وہ ستائیس سال فلسفہ پڑھاتے رہے ۔ اقبال ان کے لیکچروں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے ۔ پروفیسر صاحب کے کمرے میں بھی اکثر فلسفیانہ بحثیں جاری رہتی تھیں جن میں اقبال بھی حصہ لیتے تھے ۔ اقبال نے میک ٹیگرٹ کے فلسفے پر ایک مضمون بھی لکھا ہے ، جس میں بتایا ہے کہ "میری ملاقات تقریباً ہر روز ان کے کمرے میں ہوتی تھی اور مختلف مسائل و

۱۔ ولادت ۳ ستمبر ۱۸۶۶ء ۔ وفات ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء بعارضۂ قلب ۔

افکار پر تبادلۂ خیالات رہتا تھا - پر پھر کر ہماری گفتگو وجود باری تعالٰی کے مسئلے پر آ جاتی تھی - میک ٹیگرٹ خدا کی ہستی کے منکر تھے - وہ اپنے زبردست دلائل اور اپنی قوی منطق سے مجھے چپ تو کرا دیتے تھے لیکن وہ مجھے قائل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے -"[1]

ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری :

پروفیسر میک ٹیگرٹ سے اقبال نے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا سائنٹفک انداز سیکھا اور اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۰۷ع میں مکمل کرکے پی ایچ - ڈی کی سند کے لیے جرمنی کی میونخ یونی ورسٹی میں پیش کر دیا - کیمبرج یونی‌ورسٹی کی سفارش پر میونخ یونی‌ورسٹی نے اقبال کو خاص رعایتیں دیں - ایک تو یہ کہ یونی ورسٹی کی حاضری معاف کردی - دوسری مقالہ لاطینی یا جرمنی زبان کی بجائے انگریزی میں پیش کرنا قبول کر لیا - البتہ زبانی امتحان جرمن زبان میں دینا ضروری قرار دیا - چنانچہ جرمن زبان میں امتحان کے لیے اقبال نے "تاریخ عالم" پر ایک مختصر سا مقالہ علیحدہ لکھا - جولائی ۱۹۰۷ع کے تیسرے ہفتے میں جرمنی پہنچے - ہائیڈل برگ اور میونخ میں چند ماہ قیام کرکے جرمن زبان اور فلسفے میں اتنی استعداد پیدا کی کہ زبانی امتحان میں کامیاب ہو کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی - اقبال کا یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۰۸ع میں لیوزک کمپنی لندن نے کتابی صورت میں شائع کیا - یہ کتاب[2] انگریزی کا نہایت اعلٰی

۱- Thoughts and Reflections of Iqbal, p. 124

۲- Development of Mataphysics in Persia ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقاء -

ممولہ ہے - انگلستان کے نقادوں نے وہاں کے مشہور پرچوں میں اس کے متعلق عمدہ رائیں لکھی ہیں - اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی "فلسفۂ عجم" کے نام سے چھپ چکا ہے -

جرمنی کے متعلق تاثرات :

جرمنی کی عام معاشی حالت اور علمی فضا کے بارے میں ایک استفسار کے جواب میں ۱۷ اگست ۱۹۲۲ع کو اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا :

"جرمنی سے متعلق میری معلومات اب پرانی ہو چکی ہیں - تیرہ برس گزرے ، میں اس ملک میں تھا - اس کے بعد اس ملک کو تاریخ عالم کی ایک عظیم ترین جنگ سے دو چار ہونا پڑا اور اس وقت وہ ملک دنیا کی معاشی تاریخ کے ایک عدیم المثال مالی بحران میں مبتلا ہے - میرا خیال ہے کہ جرمنی کی درس گاہوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں ـــ میں تو صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنا مقالہ (ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقاء) میونک یونی ورسٹی میں پیش کیا ، جس کے اربابِ اختیار نے مجھے یونی ورسٹی میں قیام کی شرط سے مستثنٰی کر دیا اور مجھے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی - جرمن یونی ورسٹیاں بالعموم تین سال یا ڈیڑھ سال کے لیے لیکچروں میں حاضری پر اصرار کرتی ہیں - حاضری کی مدت کا تعین امیدوار کی اہلیت پر منحصر ہوتا ہے اور عام طور پر مقالہ جرمن زبان میں مرتب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے - مجھے اپنے کیمبرج کے استادوں کی

سفارش کی بنا پر اس سے مستثنٰی قرار دیا گیا۔ پی ایچ۔ ڈی کا امتحان زبانی جرمن زبان میں ہوا جو میں نے دوران قیام میں تھوڑی بہت سیکھ لی تھی۔"[1]

بیرسٹری کی سند :

جرمنی سے واپس آ کر اقبال نے لندن میں اپنا قانون کا بقیہ کورس پورا کیا اور بیرسٹری کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

تقریروں کا سلسلہ :

انگلستان آ کر طالب علمی کے زمانے میں اقبال کچھ عرصہ تقریروں کے مشغلے میں منہمک ہو گئے تھے، لیکن بعد میں اسے بالکل ترک کر دیا۔ کہا (انبیاء اور مصلحینِ اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، ان میں روحانیت کا فقدان ہو جاتا ہے۔ اب امتحانوں سے فارغ ہو کر انھوں نے اسلام پر چھ پبلک لیکچر دیے۔ ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں کہ

"انگلستان میں میں نے اسلامی مذہب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے، دوسرا اسلامی تصوف پر فروری کے تیسرے ہفتے میں ہو گا۔ باقی لیکچروں کے مضامین یہ ہوں گے: مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر، اسلامی جمہوریت، اسلام اور عقلِ انسانی وغیرہ۔"[2]

۱۔ اقبال نامہ، جلد دوم، صفحات ۲۲۸ - ۲۲۹ -
۲۔ اقبال نامہ، جلد دوم، ص ۳۵۸ -

یہ لیکچر بہت مقبول ہوئے۔ ان سے آپ کی مذہبی تحقیقات کی دھوم مچ گئی اور آپ کو پروفیسر طامس آرنلڈ کی جگہ، جو چند ماہ کی رخصت لے کر مصر گئے تھے، یونی ورسٹی کالج لندن میں عربی کا پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں انقلاب بپا ہو رہا تھا (جس کی بدولت عبدالحمید ثانی ۲۸ اپریل ۱۹۰۹ء کو معزول ہوا اور ترکی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی) اقبال نے لندن کے رسالہ ''سوشیالوجیکل ریویو'' میں ایک فاضلانہ مضمون ''اسلام اور خلافت'' تحریر کیا، جس میں بتایا کہ جمہوریت اسلام اور آئین انتخاب خلیفہ مذہب و سیاست کا مشترک اور واحد مطمح نظر ہے۔ اس مضمون کا اُردو ترجمہ منشی محمد الدین فوق مرحوم کی فرمائش پر اقبال کی اجازت سے چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ مرحوم نے ۱۹۲۳ء میں کیا، جو ''خلافتِ اسلامیہ'' کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں چھپ چکا ہے۔

استادوں کے ساتھ تعلقات

یہاں کے اساتذہ اقبال جیسے ذہین شاگرد کے ساتھ کس محبت اور احترام کا برتاؤ کرتے تھے اور سعادت مند شاگرد کے دل میں اپنے شفیق اور فاضل استادوں کی نسبت کس قسم کے جذباتِ احسان مندی پائے جاتے تھے، اس کا ہلکا سا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ:

ڈاکٹر طامس آرنلڈ سے تو اقبال لاہور ہی میں مانوس ہو چکے

تھے - انھی کی کشش اقبال کو کھینچ کر لندن لے گئی تھی - اقبال وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اکتساب فیض کرتے رہتے تھے - ان سے اقبال کو جو روحانی عقیدت تھی ، اسی کا نتیجہ تھا کہ اقبال نے اپنی پہلی انگریزی تصنیف ''ڈیولپمنٹ آف میٹا فزکس ان پرشیا'' جو ۱۹۰۸ع میں لیوزک کمپنی لندن نے شائع کی تھی ، موصوف کے نام منسوب کی - چنانچہ کتاب کے پہلے صفحے پر یہ تحریر درج ہے :

''انتساب !

بنام پروفیسر ٹی - ڈبلیو - آرنلڈ ایم - اے -

مشفق من جناب آرنلڈ صاحب !

یہ چھوٹی سی کتاب اس ادبی اور فلسفیانہ تربیت کا میوۂ نخستیں ہے جو میں گزشتہ دس سال سے آپ سے پارہا ہوں اور بطور اظہار تشکر میں یہ کتاب آپ کے نام منسوب کرنے کی اجازت چاہتا ہوں - آپ نے ہمیشہ میری ناچیز کوششوں کو بکمال فراخ دلی سراہا ہے - مجھے امید ہے کہ ان صفحات کو بھی آپ اسی نظر شفقت سے دیکھیں گے -

آپ کا نیاز کیش شاگرد

اقبال''

استاد کے دل میں اپنے ہونہار شاگرد کی جو قدر و منزلت تھی اس کا ذکر عطیہ فیضی نے اس طرح کیا ہے : ''جون ۱۹۰۷ع میں پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کو جرمنی میں ایک نایاب قلمی نسخے کے مطالعے کے لیے بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا - اقبال نے عذر کیا کہ وہ اپنے استاد کے مقابلے میں مبتدی ہے - پروفیسر آرنلڈ نے جواب دیا ''مجھے پختہ یقین ہے کہ اس معاملے میں شاگرد استاد سے بازی لے

جائے گا۔"[۱]

جولائی ۱۹۲۰ء میں جب ڈاکٹر آرنلڈ کے انتقال کی خبر ملی تو اقبال نے لیڈی آرنلڈ کے نام جو تعزیتی خط لکھا اس میں اپنے درد و غم کا اظہار یوں کیا :

"لاہور

۱۶ جولائی ۱۹۳۰ء

محترمہ لیڈی آرنلڈ !

میرے لیے یہ بیان کرنا ناممکن ہے کہ جب سر طامس آرنلڈ کی ناگہانی وفات کی خبر ہم تک ہندوستان میں پہنچی تو ہم سب کو کس قدر دلدوز صدمہ ہوا ۔ آپ کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ سر طامس سے ان کے شاگردوں کو اور ان تمام لوگوں کو ، جو ان سے واقف تھے ، کس درجہ محبت و عقیدت تھی ۔ مجھے معلوم ہے کہ صدمے کے الفاظ آپ کو اور آپ کی صاحب زادی نینسی کو بہت کم تقویت پہنچا سکتے ہیں ، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے غم میں نہ صرف انگلستان بلکہ ہندوستان اور باقی دنیا کے ان تمام ممالک کے لوگ شریک ہیں جہاں سرطامس کا کام بحیثیت ایک مستشرق کے معروف تھا ۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی وفات سے نہ صرف برطانوی دنیائے علم کو ، بلکہ تمام دنیائے اسلام کو بے حد نقصان پہنچا ہے ، جس کے فکر و ادب کی خدمت میں آنجہانی نے تادم آخر کمی نہ آنے دی ۔ میرے لیے یہ زیاں ایک ذاتی

۱۔ اقبال ، از عطیہ فیضی ، ترجمہ عبدالعزیز خالد ، صفحات ۲۱ - ۲۲ ۔

حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ انھی کا فیضان تھا جس نے میری روح کی تربیت کی اور اسے جادۂ علم پر گامزن کیا ۔ یہ صحیح ہے کہ دنیاوی نقطۂ نظر سے ان کی زندگی کا تابندہ شعلہ اب خاموش ہو چکا ہے لیکن میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سرطامس کی طرح اپنی زندگی محبت اور خدمت کے لیے وقف کر دیتے ہیں ، ان کے لیے موت 'مزید روشنی' کے مصداق ہوتی ہے ۔

میں تہ دل سے دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ان کی شفیق روح کو جاوداں امن و عافیت بخشے اور آپ کو اور نینسی کو یہ حوصلہ عطا کرے کہ ان کی ناگہانی موت کا صدمہ آپ صبر کے ساتھ برداشت کر پائیں ۔"[1]

آپ کا مخلص

محمد اقبال"

ڈاکٹر براؤن :

مشہور مستشرق ڈاکٹر ای ۔ جی ۔ براؤن فارسی ادبیات کے زبردست ماہر اور نقاد تھے ۔ وہ ادبِ ایران اور انقلابِ ایران جیسی بیسیوں شہرۂ آفاق کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ اپنے مطالعے کی بنا پر اسلام سے ایک گونہ ہمدردی رکھتے تھے ۔ ان کے مربیانہ اخلاص و محبت کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اقبال کو فارسی ادب و شعر اور دیگر اسلامی علوم کے مطالعے کا موقع مل گیا ۔ دوسرے اسلامی تہذیب اور مغربی تمدن کے موازنے نے ان کی آنکھیں کھول

۱- فنون ، لاہور ، اقبال نمبر ، دسمبر ۱۹۷۷ء ، ص ۱۳۲ ۔

دیں - تیسرے ان کا علم اتنا وسیع اور زبان اتنی پختہ ہو گئی کہ وہ عہدِ نو کے شاعر کی حیثیت سے ، جو شاعری اور پیغمبری کی دو گونہ صفات سے متصف ہو ، اسلامی اصولوں کی علم برداری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اپنے خیالات اور افکار کے لیے ایک نئی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے - پہلے وہ فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دیتے اور مظاہر قدرت میں انوارِ ربانی کا مشاہدہ کرتے تھے ، اب وہ پیکرِ انسانی میں صفاتِ الٰہی کے جلوے دیکھنے لگے - ۶ جنوری ۱۹۲۶ع کو جب ڈاکٹر براؤن کا انتقال ہوا تو اقبال نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا - لاہور کے مشہور خطاط منشی اسد اللہ سے نہایت خوش خط لکھوایا اور پاکستان کے معروف مصور عبدالرحمٰن چغتائی سے اس پر نقاشی کرائی اور ڈاکٹر نکلسن کو کیمبرج روانہ کیا :

نازشِ اہلِ کمال ای جی براؤن
فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ او سینہ چاک
از فراقِ او دلِ مشرق دونیم
تا بفردوسِ بریں ماوا گرفت
گفت ہاتف ''ذالک الفوز العظیم''

۱۹۲۶ع

پروفیسر الیگزنڈر :

پروفیسر الیگزنڈر ایک اور نامور اور فاضل بزرگ لندن یونی ورسٹی میں فلسفے کے استاد اور مستند اہل رائے تھے - اقبال کے نزدیک یہ بھی ایک زبردست علمائے فلسفہ میں سے تھے - ''مارل آرڈر

اینڈ پروگریس'' (اخلاق نظام اور ترقی) ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ہمارے خیالات، ہمارے نصب العین اور ہمارے اطوارِ حیات کیونکر متواتر اور مسلسل ایک خاموش اور غیر خوں ریز جنگ میں مصروف ہیں اور آپس میں گتھم گتھا ہو کر ایک دوسرے کو فنا اور جذب کرتے رہتے ہیں۔''[1]

اقبال نے پروفیسر نکلسن کو ایک خط میں لکھا تھا:

''انگریزوں کو چاہیے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر[2] کے بجائے اپنے ایک ہم وطن کو راہنما بنائیں۔ میری مراد الیگزنڈر سے ہے جن کے گلاسگو والے خطبات پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات میں انھوں نے ''خدا اور الوہیت'' کے عنوان سے جو باب لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں:

''گویا ذہنِ انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تخریبی قوت ہے، جسے کائناتِ عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس و اجتہاد کی رہنمونی سے ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ بطنِ گیتی میں اس قسم کی ایک قوت موجود ہے لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ قوت کیا ہے؟ ہم نہ تو اسے محسوس کر سکتے ہیں اور نہ ہمارا ذہن اس کے تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا کے لیے قربان گاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا

۱۔ فنون، اقبال نمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۔
۲۔ لطشے۔

چیز ہے ، اس کا احساس کیسا ہوتا ہے ؟ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں ۔"

الیگزنڈر کے خیالات میرے عقاید کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں ۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے لیکن میں الیگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی جو وقت کے تابع ہوگا ۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکرِ خاکی میں ظاہر ہوگی ۔ خدا کے متعلق میرا عقیدہ الیگزنڈر کے عقیدے سے مختلف ہے ۔ لیکن اگر الیگزنڈر ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کرکے انسانِ کامل کے تخیّل پر اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو انہیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا ۔"[1]

میک ٹیگرٹ :

ڈاکٹر میک ٹیگرٹ عجیب و غریب خیالات کے انسان تھے ۔ وہ ہستیِ باری تعالیٰ کے تو منکر تھے لیکن حیات بعد الموت اور تناسخ کے قائل تھے ۔ مروجہ رسمی مذاہب سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن کلیسائے انگلستان (چرچ آف انگلینڈ) کے بڑے حامی تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ انسان مذہبی قیود سے آزاد ہو کر بھی اخلاق اور معاشرت کے ضابطے کی پابندی کر سکتا ہے ۔ اقبال کی رائے تھی کہ میک ٹیگرٹ کا فلسفہ ایک خاص قسم کا تصوف ہے ، جس نے

۱۔ اقبال نامہ ، حصہ اول ، صفحات ۳۵۸ — ۳۶۰ ۔

عقل کی مدد سے ان کو یزداں شناسی کی راہ دکھائی ہے۔ وفات (۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء) سے ایک روز قبل ڈاکٹر میک ٹیگرٹ نے اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

"جانِ من! تم سے جدا ہونے کا غم تو ضرور ہے لیکن تم جانتی ہو کہ میں موت سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

اقبال فرماتے تھے کہ موت سے بے خوفی کا اس طرح برملا اظہار وہی شخص کر سکتا ہے جس نے حقیقتِ کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے کر لیا ہو۔ اتفاق کی بات ہے کہ اقبال نے بھی اپنی وفات سے ایک دن پہلے اپنے مضطرب اور پریشان تیمارداروں کو تسلی دیتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ "میں مسلمان ہوں، میں موت سے نہیں ڈرتا۔"[1]

۱۹۲۰ء میں جب پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی ترجمہ کیا تو ڈاکٹر میک ٹیگرٹ نے اقبال کو لکھا:

"مجھے آپ کی مثنوی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی، لیکن آپ نے اپنے خیالات میں یہ تبدیلی کیونکر پیدا کر لی؟ جب آپ یہاں تھے اور ہمارے درمیان فلسفیانہ بحثیں ہوا کرتی تھیں تو آپ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اب اسی نظریے کی آپ مخالفت کر رہے ہیں۔"

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"سوال غالباً اپنے اپنے ملک کے مقامی اور قومی تقاضوں کا ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہندوستان ضرورت سے

۱۔ عاشق بٹالوی کا مضمون "اقبال کے استاد ڈاکٹر میک ٹیگرٹ" آئینۂ اقبال، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۲۰ — ۲۳۔

زیادہ دروں بینی اور تفکّر میں مبتلا ہے ۔ اس کے برعکس انگلستان ہی نہیں ، پورا یورپ اس تفکّر سے محروم ہے ۔ آپ کو ہم سے عمل کا درس لینا چاہیے اور ہمیں آپ سے غور و فکر کی نعمت حاصل کرنے کی ضرورت ہے ۔''[1]

پروفیسر سارلے اور پروفیسر نکلسن :

پروفیسر سارلے اور پروفیسر نکلسن کی رائے اپنے شاگرد کے متعلق کیا تھی ؟ اس کا اظہار اس وقت ہوا جب اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے ۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۱ء کو ان کی مادرِ علمی کیمبرج یونی ورسٹی کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب منعقد کی گئی ۔ پارٹی کا اہتمام یونی ورسٹی آرمز ہوٹل میں ہوا جس میں پروفیسر سارلے نے تقریر کرتے ہوئے کہا :

''آج سے ۲۵ سال قبل جب ڈاکٹر سر محمد اقبال کیمبرج میں پڑھتے تھے ، تو اگرچہ وہ زیادہ بولتے نہیں تھے اور خاموشی سے رہتے تھے ، لیکن کیمبرج سے جا کر انھوں نے جو عظمت اور شہرت حاصل کی ، وہ ہمارے لیے تعجب انگیز نہ تھی ۔ اس لیے کہ ہم طالب علمی کے زمانے سے ہی جانتے تھے کہ ان میں جوہر موجود ہیں اور یہ ضرور چمکیں گے ۔''[2]

۱۔ عاشق بٹالوی : مضمون ''اقبال کے استاد ڈاکٹر میک ٹیگرٹ'' مطبوعہ آئینۂ اقبال ، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ، صفحات ۲۰ — ۲۳ ۔

۲۔ سفرنامۂ اقبال ، مرتبہ محمد حمزہ فاروق ، صفحات ۵۱ - ۵۲ ۔

اقبال نے اپنی تقریر میں اس اعزاز کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر افسوس کیا کہ آج کی صحبت میں پروفیسر براؤن اور میک ٹیگرٹ موجود نہیں - پھر فرمایا :

''میں ان نوجوانوں کو جو کیمبرج میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں ، چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں - کیمبرج وہ سرچشمۂ علم و فضل ہے جس نے یورپی تہذیب و تمدن کی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے - میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریت اور مادیت سے بچیں - اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب اور حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا - اس سے ان کی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہوگئی اور اس کا رخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا ــــ میرا عقیدہ ہے کہ انسانی انا کائنات کا مرکز ہے - یہ اولین نقطۂ نظر ہے - فلسفی کثرت سے وحدت کی طرف آئے - صحیح راستہ یہ ہے کہ وحدت سے کثرت کی طرف جائیں -

''میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض[1] پیش گوئیاں کی تھیں ، اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا

۱- مثلاً :

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیــــانہ بنے گا ، ناپائدار ہوگا

یا

دیکھ لو گے سطوتِ رفتــار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

تھا - یہ ۱۹۰۷ع کی بات ہے - اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ع میں میری یہ پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہو گئیں - ۱۹۱۴ع کی جنگِ یورپ دراصل اہلِ یورپ کی اس غلطی کا نتیجہ تھی، جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، یعنی مذہب و حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کا ظہور - بالشوزم مذہب و حکومت کی علیحدگی کا طبعی نتیجہ ہے - میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیت سے بچیں -

"چند روز قبل انگریز خواتین کے ایک بڑے مجمعے میں مجھ سے کہا گیا کہ عورتوں کو کوئی نصیحت کروں - میں نے انہیں کہا تھا کہ انگریز خواتین کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم فرض یہ ہے کہ وہ آئندہ نسل کو دہریانہ مادیت کے چنگل سے بچائیں - مذہب بے حد ضروری چیز ہے - مذہب عرفان و ایقان کا نام ہے -"[1]

اسی طرح لندن کی ایک شاندار تقریب میں، جو اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کی طرف سے لندن کے ہوٹل والڈورف میں منعقد کی گئی، پروفیسر نکلسن نے فرمایا:

"میں آج سے پچیس برس پیشتر ڈاکٹر اقبال سے کیمبرج میں ملا تھا - طالب علمی کے زمانے میں کوئی شخص کسی نوجوان کے شاندار مستقبل اور آئندہ حاصل ہونے والی شہرت کا اندازہ نہیں کر سکتا، مگر ڈاکٹر اقبال کے متعلق اس وقت بھی یقین تھا کہ وہ بہت بڑے مرتبے پر

۱- سفرنامۂ اقبال، صفحات ۵۱ - ۵۲ -

پہنچیں گے اور بقولِ سعدی :

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی"

اس کے بعد ڈاکٹر نکلسن نے اقبال کی شاعری کے متعلق سرسری انداز میں اپنے خیالات پیش کیے اور فرمایا کہ وہ فلسفے کے دقیق مسائل کو نہایت دلکشا اور دلفریب انداز میں پیش کرتے ہیں - سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص پیغام پیش کر رہے ہیں ، جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے اور یہ پیغام دہریانہ مادیت کے خلاف ہے - ابتدا میں لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ ایک دوسرے نطشے ہیں یا نطشے کے خیالات و افکار کو فارسی کا جامہ پہنا رہے ہیں لیکن عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی تعلیم مختلف ہے - درحقیقت ان کی شاعری کا مقصد بہ اصطلاحِ مولانا روم 'جہادِ اکبر' ہے -"[1]

یہی وہ فاضل ہستیاں تھیں جن سے فیض یاب ہونے کا اعتراف اقبال نے اس طرح کیا ہے :

خرد افروز مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے :

اپنے ہم وطنوں میں سے شیخ عبدالقادر مدیر 'مخزن' کی قربت تو

۱- سفرنامۂ اقبال ، صفحات ٦٧ - ٦٨ -

دو سال تک اقبال کو نصیب رہی - سیر و تفریح میں بھی اکثر ساتھ رہتا تھا اور وقت اچھا کٹتا تھا - ان کے علاوہ مشیر حسین قدوائی، سیّد امیر علی، سیّد علی امام، عبداللہ مامون سہروردی، ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی، ڈاکٹر انصاری، مسز سروجنی ناڈیڈو اور محترمہ عطیہ فیضی سے بھی یہاں ملاقات کے مواقع میسر آئے اور کئی سیاسی اور سماجی مجلسوں میں مل جل کر کام کیا -

ادبی سرگرمیاں :

شیخ عبدالقادر 'بانگِ درا' کے دیباچے میں اقبال کی اس زمانے کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :

"۱۹۰۵ع سے ۱۹۰۸ع تک اقبال کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا - یہ زمانہ ہے جو انھوں نے یورپ میں بسر کیا - گو وہاں انھیں شاعری کے لیے نسبتاً کم وقت ملا اور ان نظموں کی تعداد جو وہاں کے قیام میں لکھی گئیں، تھوڑی ہے،[۱] مگر ان میں ایک خاص رنگ وہاں کے مشاہدات کا نظر آتا ہے - اس زمانے میں دو بڑے تغیر ان کے خیالات میں آئے - ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا اور ملاقات کے موقعے ملتے رہتے تھے - ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری ترک کر دیں[۲] اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں

۱- صرف چوبیس نظمیں اور سات غزلیں -

۲- مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیغام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے ، اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے ۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیے ۔ بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے ، اس لیے ایسی مفید اور خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا ۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے ۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترکِ شعر کو بدل دیں گے اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں ۔ اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے ۔ ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اس کا تو یوں خاتمہ ہوا مگر دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا ۔ یعنی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اردو زبان کی جگہ اپنا ذریعۂ اظہارِ خیال بنا لیا ۔“[۱]

ان تغیرات کی وضاحت اقبال نے نومبر ۱۹۳۱ع میں اپنی ایک

۱۔ بانگِ درا ، صفحات ۴ - ۵ - کلیاتِ اقبال ، ص ۱۵ -

تقریر میں خود بھی کی ہے - یہ تقریر لندن کی اقبال ایسوسی ایشن کے سپاس نامے کے جواب میں ہوٹل والڈورف میں ہوئی تھی - اس تقریب میں گول میز کانفرنس کے تقریباً تمام مندوبین کے علاوہ کم و بیش چار سو منتخب اصحاب موجود تھے - اقبال نے فرمایا :

”۱۹۰۵ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دل کشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسان کے لیے امید ، ہمت اور جرأتِ عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے - یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کے لیے سائنس تھی ، جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی - ۱۹۰۸ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی - ان حالات میں میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے - میں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور میں اس درجے منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں - ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں ، لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی - بہرحال میں نے ۱۹۱۰ء میں

اپنے خیالات کو مدِ نظر رکھ کر اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' لکھنی شروع کی - اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کیوں فارسی میں شعر کہنے شروع کیے -

بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا - میں نے اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' ابتدا میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے - میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں - اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یہ یورپ پہنچ جائے گی - بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دلکشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اسی زبان میں شعر کہتا رہا -

میں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے ان پر ابتدا میں بہت سے اعتراض ہوئے ، حتّٰی کہ میری نسبت کہا گیا کہ میں دہریت کی تبلیغ کر رہا ہوں اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے پیش ہوا - سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی کمزوری اور انحطاط کا مجھے جو احساس ہوا ، اسے میں نے مختلف اشعار کے روپ میں پیش

کیا ہے ۔ مثلاً :

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار
گرچہ در کاسۂ زر لعل روانے دارد"[۱]

مس عطیہ فیضی :

قیامِ انگلستان ہی کے دنوں میں اقبال کی ملاقات مس عطیہ فیضی سے ہوئی ۔ وہ فلسفے کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں ۔ ان کی ذہانت اور وسعتِ مطالعہ کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوگا کہ وہ اور اقبال دونوں مستند اہلِ علم اور ماہرینِ فلسفہ کے علمی مباحث میں شریک ہوتے تھے ۔ اقبال نے عطیہ کی رائے کو عملاً تسلیم کیا ، یہاں تک کہ اپنا پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ اور تاریخِ عالم کا مسودہ پورے کا پورا انھیں سنایا ۔

عطیہ اس زمانے میں اپنا روزنامچہ لکھتی تھیں جو اب تک محفوظ ہے ۔ اس کی مدد سے موصوفہ نے اکیڈمی آف اسلام کی طرف سے "اقبال" کے زیرعنوان ایک مقالہ انگریزی زبان میں شائع کیا ہے جس میں اقبال کے خطوط اور غیر مطبوعہ اشعار بھی شامل ہیں ۔ اس میں اقبال کے قیامِ انگلستان اور جرمنی کے دلچسپ حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہیں ۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے ۔

عطیہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ہندوستانی طلبہ کا ایک جشنِ تفریح منعقد ہوا ۔ ڈاکٹر انصاری بھی اس میں شریک تھے ۔ ہر شخص نے اپنے اپنے کمالات سے حاضرین کو محظوظ کیا ۔ اقبال نے مزاحیہ اشعار میں حاضرین میں سے ہر ایک کا ایسا نقشہ کھینچا کہ

۱۔ سفرنامۂ اقبال ، مرتبہ حمزہ فاروقی ، صفحات ۷۰ - ۷۱ ۔

سننے والے مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے ۔ بعض دوستوں نے یہ اشعار لکھنے کی کوشش کی مگر اقبال نے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ ایک باہمی تفریح کی ہنگامی چیز ہے ۔ اسے محفوظ رکھنا ٹھیک نہیں ۔

عطیہ ہی کے ذریعے اقبال کی ذہانت کا یہ واقعہ بھی معلوم ہوا کہ جون ۱۹۰۷ء میں پروفیسر آرنلڈ نے دریائے کیم کے کنارے ایک تفریحی محفل آراستہ کی ، جس میں بہت سے استاد اور شاگرد جمع تھے ۔ پروفیسر آرنلڈ نے زندگی اور موت کے مسئلے پر ایک بحث چھیڑ دی ۔ حاضرین نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا لیکن اقبال خاموش رہے ۔ پروفیسر آرنلڈ نے ان کی رائے دریافت کی تو اقبال نے مسکرا کر جواب دیا : ”زندگی موت کا آغاز ہے اور موت زندگی کی ابتدا ۔“

اس زمانے کے بعض دلچسپ لطائف دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہوئے ہیں جو اقبال نے خود سنائے تھے ۔ مثلاً لندن میں ایک مسلمان اچار ، مربہ اور چٹنی بیچا کرتا تھا ۔ اقبال اس کے ایک مستقل گاہک تھے ۔ اس کے متعلق خود ایک واقعہ سنایا ۔ فرمایا : ایک دن اس دکاندار نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں ؟ میں نے پنجاب اور سیالکوٹ بتایا ۔ نام پوچھا تو کہا ۔ اقبال ۔ اس نے فوراً کہا ”اقبال اور وطن سے باہر !“ میں نے کہا :

گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

اس کے بعد اس چٹنی فروش نے پوچھا ”آپ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں ؟“ میں نے کہا — ”اقبال کا تعلق کسی قوم اور ذات سے نہیں ہوتا ۔“

شیطان کے چیلے :

کیمبرج میں چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی ۔

ایک صاحب پوچھنے لگے : ''مسٹر اقبال ! یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیانِ مذہب دنیا میں آئے وہ بلا استثناء ایشیا میں مبعوث ہوئے ۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا ۔'' اقبال نے جواب دیا ''بھئی شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جا لیا ۔ اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو ، اس لیے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ، ایشیا میں مبعوث ہوئے ۔'' وہ صاحب بول اٹھے ''تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے ؟'' اقبال نے جواب دیا ''یہ تمہارے میکاولی اور مشہور اہلِ سیاست اسی کے رسول تو ہیں ۔''[1]

بدھ مت :

کیمبرج میں بی ۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اقبال نے قانون کی تعلیم کے لیے لندن کے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا تھا ۔ اقبال وہاں جاتے تو پروفیسر آرنلڈ کے ہاں قیام کرتے ۔ شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف جس ریل گاڑی میں سفر کرتے وہ ایک جگہ جا کر ختم ہو جاتی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم سے دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا ۔ اقبال کا اپنا بیان ہے کہ ایک روز حسبِ معمول میں گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے ۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا : ''یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں ۔ ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے'' ۔ چنانچہ مجھ سے

۱۔ آثارِ اقبال ، صفحات ۵۹ ۔ ۶۰ ۔ اقبال کامل ، ص ۹۲ ۔ اقبال کے جواہر ریزے ، صفحات ۱۳ ۔ ۱۴ ۔

پوچھا گیا ۔ میں نے کہا : ''ابھی جواب دیتا ہوں'' ۔ یہ کہہ کر چپ رہا ۔ چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا ۔ میں نے پھر کہا : ''ابھی جواب دیتا ہوں ۔'' وہ کہنے لگے ''شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں ؟'' میں نے کہا ''ہاں'' ۔

اس دوران میں اسٹیشن آ گیا اور گارڈ ''آل چینج'' یعنی ''سب بدل جاؤ'' پکارنے لگا ۔ میں نے کہا ''بس یہی بدھ مذہب ہے ۔ یعنی مسئلہ تناسخ جو بدھ مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے ۔''[1]

عیسائی مبلّغ :

ایک دفعہ اقبال اپنا فارغ وقت گزارنے کے لیے چند دنوں کے لیے اپنے انگریز دوست کے ہمراہ اس کے گاؤں گئے ۔ خود فرماتے ہیں :

''جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو تعطیلات کے زمانے میں کچھ دنوں کے لیے میں اپنے ایک ہم سبق انگریز دوست کے ہمراہ اس کے وطن چلا گیا ۔ اس کا گھر سکاٹ لینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے میں تھا ۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا ایک مشنری ، جو ہندوستان سے آئے ہیں ، آج شام قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے اور بتائیں گے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر فروغ حاصل ہو رہا ہے ۔ میں اور میرے میزبان دونوں لیکچر سننے کے لیے پہنچے ۔ سامعین میں عورتیں اور مرد کافی تعداد میں تھے ۔ مشنری نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان آباد ہیں ، لیکن ان لوگوں کو انسان

---

۱ - اقبال کامل ، ص ۹۱ - اقبال کے جواہر ریزے ، صفحات ۱۲ - ۱۳ -

کہنا جائز نہیں۔ عادات و خصائل اور بود و باش کے اعتبار سے یہ لوگ انسانوں سے بہت پست اور حیوانوں سے کچھ اوپر ہیں۔ ہم نے سالہا سال کی جد و جہد سے ان حیوان نما انسانوں کو تھوڑی بہت تہذیب سے آشنا کیا ہے۔ لیکن کام وسیع اور اہم ہے۔ آپ ہمارے مشن کو دل کھول کر چندہ دیجیے تاکہ اس عظیم الشان مہم میں، جو ہم نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے جاری کر رکھی ہے، زیادہ سے زیادہ کامیابی ہو۔ یہ کہہ کر مشنری نے میجک لینٹرن سے سامنے لٹکے ہوئے پردے پر ہندوستانیوں کی تصویریں دکھانا شروع کیں۔ ان میں بھیل، گونڈ، دراوڑ اور اڑیسہ کے جنگلوں میں بسنے والی قوم کے نیم برہنہ افراد کی نہایت مکروہ تصاویر تھیں۔

جب لیکچر ختم ہو گیا تو میں نے کھڑے ہو کر صدر جلسہ سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے بخوشی اجازت دے دی تو میں نے بڑے جوش سے پچیس منٹ تقریر کی۔ میں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں خالص ہندوستانی ہوں۔ میرا خمیر اسی ملک کی سرزمین سے اٹھا ہے۔ آپ میری وضع قطع، رنگ روپ، چال ڈھال دیکھ لیجیے۔ میں آپ لوگوں کی زبان میں اسی روانی سے تقریر کر رہا ہوں جس روانی سے مشنری صاحب نے بزعم خود حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ میں نے ہندوستان میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ اب مزید تعلیم کے لیے کیمبرج میں آیا ہوں۔ آپ میری شکل و صورت دیکھ کر اور میری باتیں سن کر خود اندازہ کر

سکتے ہیں کہ مشنری صاحب نے ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مشرق دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے ، جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی شمع بلند رکھی ہے ۔ اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلام ہو گئے ہیں ، لیکن ہمارا اپنا ادب ہے ، اپنا تمدن ہے ، اپنی قومی روایات ہیں ، جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں ۔ مشنری صاحب نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کرکے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے . . . ۔

جونہی میری تقریر ختم ہوئی ، جلسے کا رنگ بالکل بدل گیا ۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہوگئے اور مشنری صاحب کو حد درجہ مایوس ہو کر وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا ۔"[۱]

مراجعت :

۱۹۰۸ع کے وسط میں اقبال اپنی ذہانت اور طباعی کا سکہ انگلستان اور جرمنی والوں پر بٹھا کر اپنے وطن واپس آئے ۔ بمبئی سے لاہور آتے ہوئے ۲۶ جولائی کو پہلے دہلی اترے اور درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہ پر سلام کے لیے حاضر ہوئے ۔ وہاں اقبال کی شمع کمال کے چند پروانے بھی جمع ہو گئے ۔ اس بزم کے حاضرین میں خواجہ حسن نظامی ، شیخ عبدالقادر

۱۔ آثار اقبال ، مرتبہ غلام دستگیر رشید ، صفحات ۳۹ — ۴۱ ۔

مدیر مخزن ، شیخ محمد اکرام جائنٹ ایڈیٹر مخزن ، مولوی محمد عبدالراشد الخیری ، میر غلام بھیک نیرنگ اور سید جالب دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ اس مرتبہ اقبال نے مندرجہ ذیل نظم پڑھی جو آپ نے ۱۹۰۳ع میں اُس وقت لکھی تھی جب ان کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد سب ڈویژنل انجینئر ملٹری ورکس بلوچستان ایک مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے اور اقبال نے یہ نظم لکھ کر کسی دوسرے کی معرفت دعا کی خاطر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں بھجوائی تھی ۔ یہ نظم تین بند کی ہے اور علامہ کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ۔ البتہ 'باقیات اقبال' میں موجود ہے :

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرّے تری درگاہ کے
میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا لے اڑا
آسماں تارے بنا کر میری گردِ راہ کے
ہے زیارت کی تمنّا ، المدد اے سوزِ عشق
پھول لادے مجھ کو گلزارِ خلیل اللہ کے
شان محبوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق
ہائے کیا رتبے ہیں اس سرکارِ عالی جاہ کے
تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشمِ تماشا خواہ کے
رنگ اس درگہ کے ہر ذرے میں ہے توحید کا
طائرانِ بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثبات نفیِ غیر میں
"لا" کے دریا میں نہاں موتی ہیں "الا اللہ" کے

عشق اس کو بھی اسی درگاہ کی رفعت سے ہے
آہ! یہ انجم نہیں، آنسو ہیں چشمِ ماہ کے
تیرے ناخن نے جو کھولی میم احمد کی گرہ
کھل گئے عقدے جہاں میں ہر خدا آگاہ کے
میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا
قیصر و فغفور درباں ہیں تری درگاہ کے
محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال[1] کا ہم نام ہوں

ترانۂ مسرت:

اقبال کے بعد میر غلام بھیک نیرنگ نے اپنی نظم ''ترانۂ مسرت'' سنائی جو آپ نے اقبال کے ولایت سے واپس آنے کی خوشی میں انبالہ سے دہلی آتے ہوئے ریل گاڑی میں کہی تھی:

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں
اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مژدۂ مسرت لائی صبا چمن میں
پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
گلشن کے سبز پوشو جھٹ پٹ سنگار کر لو
عطرِ عروس مل دو پھولوں کے پیرہن میں
ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی
نرگس لگائے سرمہ چشمانِ سحر فن میں

۱- اقبال، حضرت محبوب الٰہی کے ایک خادم کا بھی نام تھا۔

غنچوں کو حکم دے دو دیں دادِ کج کلاہی
تیکھی ادائیں نکلیں نسرین و نسترن میں
ہر غنچہ مسکرائے، ہر پھول کھل کھلائے
ہر برگ لہلہائے، رونق رہے چمن میں
ہو اہتمام ایسا آرائشِ چمن کا
باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں
سروسہی سے کہہ دو ناچے ذرا لبِ جو
قمری ترانہ گائے، جلسہ اڑے چمن میں
یورپ کی سیر کرکے اقبال واپس آئے
خوشیاں ہیں اہل دل میں عیدیں ہیں اہل فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے
غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں[1]

لاہور میں استقبال :

۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو پیر کے روز شام کے وقت گاڑی لاہور پہنچی ۔ اسٹیشن پر شاندار استقبال ہوا ۔ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی اقبال کے احباب جن میں ہندو ، مسلمان ، سکھ بلا تخصیصِ مذہب و ملت شامل تھے ، وہاں موجود تھے ۔ اقبال کا پلیٹ فارم پر قدم رکھنا تھا کہ پھولوں کی بارش شروع ہو گئی ۔ اسٹیشن کے اندر اور باہر نوجوانانِ لاہور کا خاصا ہجوم تھا ۔ عوام کے علاوہ اکثر بیرسٹر ،

۱۔ مخزن ، اگست ۱۹۰۸ء ۔

وکیل ، انجمنوں کے عہدیدار ، اخباروں کے مدیر اور دیگر رؤسائے شہر موجود تھے ۔ اقبال نہایت خندہ پیشانی سے سب کو ملے ۔ مزاج میں ولایت والوں کی سی کوئی رعونت اور خوبو نہ تھی ۔ جو سادگی اور خلوص آج سے تین سال قبل تھا ، وہی اب بھی نظر آیا ۔

ریلوے اسٹیشن سے تمام احباب بھاٹی دروازے کے باہر باغ میں آئے جہاں اقبال کے ہم وطن دوست شیخ گلاب دین مرحوم وکیل چیف کورٹ پنجاب و مؤلف قانونِ شریعت و رواج نے شاندار ضیافت کا اہتمام کیا ہوا تھا ۔ خان بہادر میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء نے (جو اس وقت تک "سر" کے خطاب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) آپ کی قابلیت کی تعریف میں تقریر کی اور منشی غلام علی خان غلامی (خوش نویس پیسہ اخبار) اور منشی اللہ یار جوگی نے خیرمقدم میں نظمیں پڑھیں ۔ یہ نظمیں اگست ۱۹۰۸ع کے کشمیری میگزین میں پوری کیفیت کے ساتھ شائع ہوئیں ۔ چند شعر حسب ذیل ہیں :

کدھر ہے کیفِ مسرت مجھے سنبھال سنبھال
کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبال

چڑھی ہوئی ہیں خوشی کے خمار سے آنکھیں
نشے سے چور ہوں ، دل ہے مرا نہال نہال

خدا کے فضل سے کی ہیں وہ ڈگریاں حاصل
کہ اس زمین میں جن کا ہے اندراج محال

تھی حاجت ایسے ہی لیڈر کی اہلِ خطہ کو
جواں خیال ، جواں سال اور جوان اقبال

تری ترقی کی دنیا ہے سامنے تیرے
زمانہ اب ہے موافق سنبھل ہمیں بھی سنبھال

گئے وہ دن کہ جو کہتے تھے اب مٹی یہ قوم
اڑا وہ رنگ جو سنتے تھے اب گرے پر و بال

(منشی اللہ یار جوگی)

آمدِ اقبال سے جشنِ طرب گھر گھر ہوا
اوج پر ہے آج پھر لاہور کا اختر ہوا
دوست اور احباب خرّم ہیں ترے دیدار سے
جب کہ تو مثلِ ہلالِ عید جلوہ گر ہوا
ڈگریاں پا کر ولایت سے تو آیا کامیاب
فلسفے میں خاص کر بیکن کا تو ہمسر ہوا
کیوں نہ ہو ہندوستاں میں تیرا شہرہ چار سو
تیرا علم و فضل اور اخلاق جب برتر ہوا
فاضلانِ دہر میں پایا ہے تو نے امتیاز
کامیابی کا قلعہ ہمت سے تیری سر ہوا

(منشی غلام علی خاں غلامی)

اس سے اگلے روز اقبال سیالکوٹ روانہ ہوگئے اور اپنے ماں باپ ، بہن بھائیوں اور عزیز رشتہ داروں سے ملے ۔

علی گڑھ کی پیشکش :

گھر پہنچتے ہی آپ کو علی گڑھ کالج کی پروفیسری پیش کی گئی مگر آپ نے بیرسٹری میں کمال حاصل کرنے کے شوق میں اسے قبول نہ کیا ۔ اس پر روزنامہ پیسہ اخبار اور دوسرے اخباروں میں بیشمار مضامین اور مراسلے شائع ہوئے ، جن میں قومی کالج کی اس خدمت سے انکار پر افسوس کا اظہار کیا گیا ۔ بعض دوستوں نے اس کی وجہ دریافت کی ۔ آپ نے ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء کو سیالکوٹ سے اپنے

دوست منشی محمد الدین فوق کو لکھا :

''آپ کا نوازش نامہ مجھے کل ملا ۔ میں ایک دو روز کے لیے بغرض مشورہ لاہور گیا تھا کیونکہ وہیں کام شروع کرنے کا ارادہ ہے ۔ 'کشمیری میگزین' دیکھتا ہوں ۔ اس میں جو کامیابی آپ کو ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور جو کچھ آپ گاہے گاہے میری نسبت اپنے کالموں میں تحریر فرماتے ہیں ، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

آپ جموں کے راستے کشمیر جائیں تو ضرور سیالکوٹ تشریف لائیں تاکہ مجھے آپ کی دوستانہ قدر و منزلت کرنے کا موقع ملے ۔ افسوس کہ میں ابھی کچھ عرصے تک آپ کے لیے کچھ نہ لکھ سکوں گا کیونکہ قانونی کتب کی طرف متوجہ ہوں ۔ چونکہ اس کام کو شروع کیا ہے اس واسطے ارادہ ہے کہ اس کو حتی الامکان پورے طور پر کروں ۔ روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے ۔ میری آرزو ہے کہ اس فن میں کمال پیدا کروں ۔ آپ بھی دعا کریں ، خدا تعالٰی اس مہم میں میرا شاملِ حال ہو ۔ انشاء اللہ نومبر میں لاہور آ کر مستقل طور پر کام شروع کروں گا ۔ اس وقت آپ سے خوب خوب ملاقاتیں ہوا کریں گی جیسے کبھی پہلے ہوا کرتی تھیں اور وہیں 'کشمیری میگزین' کی ترقیِ اشاعت کے لیے بھی چند باتیں آپ سے کروں گا ۔ باقی خیریت ہے ۔

اللہ یار صاحب جوگی کی خدمت میں میرا شکریہ پہنچائیے ۔ علاوہ ازیں تارا چند صاحب (حلوائے سوہن فروش دہلی

دروازہ) کی خدمت میں والسلام ۔"

اسی قسم کے خیالات کا اظہار آپ نے ۹ اپریل ۱۹۰۹ع کے ایک خط میں مس عطیہ فیضی سے کیا :

"بلاشبہ چند روز قبل میں نے علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کردیا ۔ میں قیدِ ملازمت سے آزاد رہنا چاہتا ہوں اور دوسرے میرا ارادہ تو اولین فرصت میں اس ملک سے ہجرت کر جانے کا ہے ۔ وجہ آپ کو معلوم ہے ۔ صرف بھائی جان کی طرف سے مجھ پر جو ایک اخلاق قرض و فرض مسلط ہے ، وہ زنجیر پا بنا ہوا ہے ۔ میری زندگی حد درجہ تلخ ہے ـــــ (یہاں اقبال نے اپنی ایک خانگی اور ذاتی پریشانی کا ذکر کیا ہے) ـــــ اس مصیبت کا واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ جاؤں یا پھر شراب نوشی کی علت ڈالوں کہ خود کشی کا مرحلہ آسان ہو جائے ۔ کتابوں کے بوسیدہ اوراق میرے لیے سرمایۂ مسرت سے خالی ہیں ۔ میری روح کا سوز انہیں اور تمام سماجی رسم و رواج کو جلا کر خاک کر دینے کے لیے کافی ہے ۔ آپ کہتی ہیں دنیا کو ایک خدائے خیر نے پیدا کیا ۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو ، لیکن دنیا کے حقائق تو کسی دوسرے ہی نتیجے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں ۔ اگر عقل انسانی کو معیار قرار دیا جائے تو یزدان کی نسبت ایک قادرِ مطلق اور ابدی اہرمن پر ایمان لانا زیادہ آسان نظر آتا ہے ۔

ان خرافات کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں ہمدردی کا طالب نہیں۔ میں تو اپنی روح سے وہ بار ہلکا کرنا چاہتا ہوں جس کے نیچے وہ دبی چلی جا رہی ہے۔ چونکہ آپ مجھے بخوبی جانتی ہیں، میں نے اپنے جذبات کے اظہار میں باک نہیں سمجھا۔

امید ہے آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں نے ملازمت سے کیوں انکار کیا۔''[1]

غرض آپ نے لاہور آ کر کام شروع کیا۔ ولایت جانے سے قبل آپ بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں کے ایک مختصر سے مکان میں رہا کرتے تھے، جو اب بھی موجود ہے اور اس پر محکمۂ آثارِ قدیمہ نے تختی لگا دی ہے۔ مگر اس مرتبہ آپ نے پہلے موہن لعل روڈ پر، جو اب اردو بازار کہلاتا ہے، ایک کوٹھی میں اقامت اختیار کی۔ پھر انارکلی کی ایک بیٹھک کرائے پر لی جو شیخ عنایت اللہ جنرل مرچنٹ کی دکان کے سامنے ہوا کرتی تھی اور جس میں آپ سے پہلے سر شفیع رہا کرتے تھے۔ وہاں سے میکلوڈ روڈ پر آئے اور آخری عمر میں میو روڈ پر (جو اب علامہ اقبال روڈ کہلاتی ہے) اپنی کوٹھی 'جاوید منزل' تعمیر کرائی اور اس میں آخری دم تک رہے۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر وکالت کو اقبال کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ اپنا دماغی بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کام ہی نہیں لیتے تھے۔ ان کی زندگی کی ساری پونجی ان کا حیات افروز کلام ہے جسے وہ عمر بھر

۱۔ اقبال نامہ، جلد دوم، صفحات ۱۱۸ - ۱۱۹ -

لٹاتے اور ٹھکانے لگاتے رہے :

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

آج یہی ملت کے لیے ایک گراں بہا خزانہ ہے ۔

روزنامہ امروز لاہور
۲۶ دسمبر ۱۹۵۳ع
(بہ نظرثانی و اضافہ)

• • •

اقبال اور فوق

بھائی فوق! خود بھی اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے:

تمنا دردِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

بصحنِ گلشنِ ما صورتِ بہار بیار
کشادہ دیدۂ گل بہرِ انتظار بیا

علامہ اقبال اور منشی محمد الدین فوق مرحوم دو دوست تھے۔ دونوں کا خمیر محبت کے ضامن سے اٹھایا گیا تھا۔ دونوں کے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کرکے پنجاب آئے اور سیالکوٹ کے ضلع میں آباد ہوئے۔ دونوں فطری شاعر تھے۔ دونوں نے شاعری میں فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی، جو اس وقت زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ دونوں کی دوستی لاہور میں ہوئی اور دونوں اسی خاک میں آسودۂ خواب ہیں۔

اقبال بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو چکے تھے کہ فوق صاحب ۳۱ جنوری ۱۸۹۶ع کو گھڑتل (ضلع سیالکوٹ) سے ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کی انجمن اتحاد کے مشاعروں کی دھوم سن کر وہاں پہنچے اور ان میں شریک ہو کر دادِ سخن دینے لگے۔ ایک مشاعرے میں جس کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی: ع

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر یوں فخر کا اظہار کیا گیا ہے:

نسیم و تشنہ[1] ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخن داں کا

۱۔ نسیم بھرت پوری اور تشنہ بلند شہری داغ کے ارشد تلامذہ تھے۔

فوق صاحب نے یہ چند شعر پڑھے :

دیا ہرچند میں نے واسطہ گیسوے جاناں کا
نہ چھوڑا تار کوئی دستِ وحشت نے گریباں کا
بہائے آنکھ نے شرمِ گنہ سے اس قدر آنسو
کہ ہر اشکِ ندامت نے دکھایا جوش طوفاں کا
کلیجہ بھی ہے زخمی ، دل بھی ہے مجروح سینے میں
مزہ ہم نے اٹھایا ہے تمھارے تیر و پیکاں کا

اس جگہ اقبال سے ملاقات ہوئی ۔ ذوق و مشرب کی یگانگت کی بنا پر دونوں کی طبیعت مل گئی اور ان میں کچھ ایسی الفت و محبت ہوگئی جسے جیتے جی زمانے کی دستبرد کوئی گزند پہنچا سکی نہ بُعدِ مکانی و مفارقتِ زمانی کا امتداد ان کی گرمی اور جوش میں افسردگی پیدا کر سکا ۔

فوق صاحب نے بعد میں ایک شاعر سے بڑھ کر اخبار نویس ، ادیب اور مؤرخ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ۔ پہلے 'پیسہ اخبار' لاہور میں ملازمت اختیار کرکے منشی محبوب عالم سے اخبار نویسی کا فن سیکھا ۔ پھر ۱۹۰۱ء میں اپنا ہفتہ وار اخبار 'پنجہ' فولاد' نکالا جو ملک میں بے حد مقبول ہوا ۔ اس کے بند ہونے پر ۱۹۰۶ء میں 'کشمیری میگزین' جاری کیا جو ۱۹۱۲ء میں ترقی کرکے ماہوار سے ہفتہ وار 'اخبار کشمیری' کی صورت اختیار کر گیا اور ۱۹۳۵ء تک کشمیر اور کشمیریوں میں زندگی کی روح پھونکتا رہا ۔ کچھ عرصہ اخبار 'کوہ نور' رسالہ 'طریقت' اور 'نظام' وغیرہ بھی ان کی ادارت میں شائع ہوتے رہے ۔

فوق صاحب پہلے اخبار نویس ہیں جنھوں نے اقبال میں ترقی پسندی کے جوہر دیکھ کر ان کے نام کو اچھالنا شروع کیا اور اپنے

اخبار کے صفحات ان کی تعریف و توصیف کے لیے وقف کر دیے - وہ 'پیسہ اخبار'، 'پنجہ فولاد'، 'کشمیری میگزین' اور 'اخبار کشمیری' کے علاوہ دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی اقبال کا ذکر اکثر چھیڑتے رہتے تھے اور ان کے کلام کی نشر و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے - اقبال سے ان کی اکثر ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں جن میں عموماً شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے یا معاملاتِ کشمیر پر بحث ہوتی تھی - دونوں ایک دوسرے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے - دونوں کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کا اظہار اکثر موقعوں پر ہوتا رہتا تھا - چنانچہ ایک واقعہ ہے کہ ایک روز فوق صاحب ملنے گئے تو اقبال کتابوں کی الماری کے پاس کھڑے کتابوں کو اس طرح ٹٹول رہے تھے جیسے کسی خاص کتاب کی تلاش ہے - جب ذرا دیر لگی تو فوق صاحب نے پوچھا: "حضرت! کس چیز کی تلاش ہو رہی ہے -" فرمایا "انگوری شربت" کی ایک بوتل رکھی تھی - کل شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی آئے تھے - دیکھ رہا ہوں کہیں وہ لے ہی نہ گئے ہوں -"[1]

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد اقبال نے پہلے پہل موہن لعل روڈ پر (جسے اب اردو بازار کہتے ہیں) ایک کوٹھی کرائے پر لی - فوق صاحب جب ان سے ملنے گئے تو خلافِ معمول اور یہ سمجھ کر کہ شاید ولایت جا کر حالات بدل گئے ہوں اور بن پوچھے سیدھے دندناتے ہوئے چلے جانا گستاخی میں داخل ہو، اپنا ملاقاتی کارڈ ان کے آدمی کو دیا - آدمی واپس آیا اور

۱- سرگزشت فوق (قلمی)، ص ۱۳۰ -

کہنے لگے : ”فرماتے ہیں ابھی فرصت نہیں ، ذرا تشریف رکھیے ۔“ چنانچہ چار پانچ منٹ کے بعد انھیں بلایا ۔ فوق صاحب نے کہا : ”یا حضرت یہ کیا ۔“ فرمایا : ”آپ خود ہی سوچیں ، آپ نے کیا کیا ؟ ایک بے تکلف دوست یہ تکلف کرے تو اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے ورنہ آپ کے لیے تو میں اس شعر کی صورت میں حاضر ہوں ۔“[1]

بصحنِ گلشنِ ما صورتِ بہار بیا　　کشادہ دیدۂ گل بہرِ انتظار بیا

مئی ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے کہ فوق صاحب اور منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی نے ایک ہی طرح میں غزلیں کہیں ۔ فوق صاحب کی غزل صوفیانہ رنگ میں تھی اور وجاہت کی دوسرے رنگ میں ۔ دونوں اقبال کے پاس گئے اور ان کو اپنا کلام سناتے رہے ۔ اسی اثناء میں ان کے منشی طاہر دین آ گئے جنھوں نے بعد میں حکیم طاہر دین ہو کر ”دلروز“ کی دوا ایجاد کر کے خوب نام پیدا کیا ۔ آخری عمر میں وہ اقبال کی جائداد کے ٹرسٹی بھی تھے ۔ مئی ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا ۔ منشی طاہر دین نے کہا : ”ایک مؤکل آیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔“ آپ نے فرمایا : ”اس کو بٹھاؤ ، یہاں سے فارغ ہو کر ان کو بلاؤں گا ۔“ فوق صاحب نے کہا : ”بابا ! پہلے پیٹ کی فکر چاہیے ، یہ شغل تو ہوتا ہی رہتا ہے ۔“ فرمایا : ”یہی شغل تو غذائے روح ہے ، اور روح ہے تو سب کچھ ہے ۔ مؤکل اگر میرا نام سن کر آیا ہے تو وہ کہیں بھاگ نہیں جائے گا ۔“ چنانچہ فوق اور وجاہت کے بعد اقبال نے اپنا تازہ کلام سنایا اور پھر مجلس برخاست ہوئی ۔[2]

۱- ایضاً ، ص ۱۲۹ ۔
۲- سرگزشت فوق (قلمی) ، ص ۱۳۰ ۔

ایک مرتبہ اقبال دردِ گردہ میں مبتلا تھے - تکلیف بے حد تھی - فوق صاحب عیادت کو گئے تو دیکھا کہ سخت اضطراب اور بے چینی کی حالت میں ہیں - تڑپ رہے ہیں اور درد کی شدت سے زار زار رو رہے ہیں - فوق صاحب نے تسلی دی تو فرمایا "اللہ میاں سے بصد عجز و زاری کہہ رہا ہوں کہ بار الٰہا ! اگر دوزخ سے نجات دینی ہے تو بے شک اس تکلیف میں مبتلا رکھ ورنہ یہاں اس عذاب سے نجات دے -" فوق صاحب نے کہا "اچھا تو اس حال میں بھی خدا تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں -"[1] اسی ظالم مرض کی صعوبت سے بے قرار ہو کر آپ نے یہ اشعار کہے تھے :

دہ مرا فرصت ھو حق دو سہ روزے دگرے
کہ دریں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست
میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجاست
حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے می خواھد
ورنہ ما را بہ جہان تو سروکار کجاست

اقبال بڑے شوق سے فوق صاحب کے اخبار ، رسالے اور کتابیں پڑھتے اور اپنے مفید مشوروں اور کلام سے ان کے کاروبار کو ترقی دینے میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے - چنانچہ ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء کے ایک خط سے اس کی تصدیق ہوتی ہے - لکھتے ہیں :

ڈیر فوق ! السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مجھے کل ملا - یہی ایک دو روز کے لیے بغرض مشورہ لاہور گیا تھا کیونکہ وہیں کام شروع کرنے

۱- ایضاً ، ص ۱۲۹ -

کا ارادہ ہے ۔ کشمیری میگزین دیکھتا ہوں ۔ اس میں جو کامیابی آپ کو ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے لیے مبارک باد دیتا ہوں اور جو کچھ آپ گاہے گاہے میری نسبت اپنے کالموں میں تحریر فرماتے ہیں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ آپ جموں کے راستے کشمیر جائیں تو ضرور سیالکوٹ تشریف لائیں تاکہ مجھے آپ کی دوستانہ قدر و منزلت کرنے کا موقع ملے ۔ افسوس ہے کہ میں ابھی کچھ عرصہ تک آپ کے لیے کچھ نہ لکھ سکوں گا کیونکہ قانونی کتب کی طرف متوجہ ہوں ۔

چونکہ اس کام کو شروع کیا ہے اس واسطے ارادہ ہے کہ اس کو حتی الامکان پورے طور پر کروں ۔ روٹی تو خدا ہر ایک کو دیتا ہے ۔ میری آرزو ہے کہ میں اس میں کمال پیدا کروں ۔ آپ بھی دعا کریں کہ خدا تعالیٰ اس مہم میں میرا شامل حال ہو ۔

انشاء اللہ نومبر میں لاہور آ کر مستقل طور پر کام شروع کروں گا ۔ اس وقت آپ سے خوب خوب ملاقاتیں ہوا کریں گی جیسے کبھی پہلے ہوا کرتی تھیں اور وہیں 'کشمیری میگزین' کی ترقی اشاعت کے لیے بھی چند باتیں آپ سے کروں گا ۔ باقی خیریت ہے ۔

اللہ یار صاحب جوگی کی خدمت میں میرا شکریہ پہنچائیے ۔ علاوہ ازیں تارا چند صاحب (تارا) (حلوائے سوہن فروش دہلی دروازہ) کی خدمت میں بھی والسلام

اقبال

از شہر سیالکوٹ ۲۹ اگست ۱۹۰۸ع"

اقبال نے فوق صاحب کی بعض کتابوں کی تصنیف کی تاریخیں بھی کہی ہیں اور دیباچے بھی لکھے ہیں - چنانچہ ۱۹۰۱ء میں جب فوق صاحب نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفتہ وار اخبار 'پنجۂ فولاد' جاری کیا تو اقبال نے اس کا تعارف اس طرح کرایا :

پنجۂ فولاد کیا ہے ؟

پنجۂ فولاد اک اخبار ہے
جس سے سارا ہند واقف کار ہے
دفترِ اخبار ہے لاہور میں
جس کا کوچہ کوچہ کوئے یار ہے
ہے روش اس کی پسندِ خاص و عام
واہ وا کیا معتدل اخبار ہے
غیر سے نفرت نہ اپنوں سے بگاڑ
اپنے بیگانے کا ہر دم یار ہے
سطر سطر اس کی مفیدِ ملک و قوم
کوئی کہہ دے یہ خبر بے کار ہے ؟

اس کے بعد اخبار کے چند مستقل کالموں مثلاً بزمِ فوق ، مذاقِ سخن ، ضامنِ صحت ، تجارت ، مشاہیر ، بندوبست کی خبریں اور لطائف وغیرہ کا ذکر ہے :

دید کے قابل نہ ہو کیوں بزمِ فوق
شمع اس محفل کی یہ اخبار ہے
ضامنِ صحت کا ایما ہے عمل
وہ ضمانت کے لیے تیار ہے
ہے تجارت کا بھی کالم کیا مفید
یوسفِ معنی کا یہ بازار ہے

وہ لطائف ہیں کہ پڑھتے ہی جنھیں
لوٹنے میں دل کبوتر وار ہے
کیوں نہ نظم و نثر کا چرچا رہے
جب ایڈیٹر ناظم و نثّار ہے
سیٹلمنٹ آفس کا بھی بندوبست
شاہد ان دعووں کا خود اخبار ہے

پھر اس کی پالیسی ، قیمت اور ایڈیٹر کے متعلق اظہار خیال ہے :

ہے مدلل رائے اس اخبار کی
ہے وہ کافر جس کو کچھ انکار ہے
رائے زن اس سے نہیں بڑھ کر کوئی
منصفوں کو اس کا خود اقرار ہے
جتنے ہیں ہم عصر دیکھیں غور سے
فقرے فقرے سے ٹپکتا پیار ہے
تین رائج سکے قیمت سال کی
اس سے سستا کون سا اخبار ہے
اور پھر انعام میں ناول ہیں مفت
واہ کیا سودا ہے ، کیا بیوپار ہے
آٹھویں دن حاضریں لے لیجیے
تابع فرمان و خدمت گار ہے
سیر اس گلشن کی کرکے دیکھیے
ایک گلشن رشک صد گلزار ہے
رنگ آزادی ہے ہر مضمون میں
سرو ہوکر بھی یہ میوہ دار ہے

کون ہے اس بانکے پرچے کا مدیر ؟
بات یہ بھی قابلِ اظہار ہے
لیجیے مجھ سے جوابِ مختصر
یہ معمّا کچھ نہیں دشوار ہے
نام ہے اس کا محمد دین فوق
عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے
شوق ہے مضمون نویسی کا اسے
طبع گویا ابرِ گوہربار ہے
گشت کے عالم میں دیکھا تھا اسے
آدمی ہشیار ، واقف کار ہے

اس نظم پر اگرچہ اس وقت کسی کا نام شائع نہیں ہوا تھا مگر فوق صاحب بتاتے تھے کہ یہ اقبال نے ارتجالاً کہی تھی -

اقبال کا بہت سا ابتدائی کلام اس اخبار میں چھپا جس میں سے کئی نظمیں اور غزلیں 'بانگِ درا' کی ترتیب کے وقت اقبال نے خود رد کردیں -

فوق صاحب نے بھی اقبال کے متعلق اس تواتر سے لکھا ہے کہ شاید ہی کوئی لکھ سکے - فوق نے جہاں کہیں اقبال کا ذکر کیا ہے احترام کے پاکیزہ جذبات کے ساتھ کیا ہے جس کے حرف حرف سے محبت کا آبِ حیات ٹپکتا ہے - اگر آج کوئی آپ کی تحریروں کو جمع کرنے بیٹھے تو اقبال کی طالب علمی کے زمانے سے لے کر وفات تک کے حالات کا بالکل ایک نیا مرقع تیار ہو سکتا ہے - اقبال کو فوق کے لکھے ہوئے حالات پر کامل اعتماد ہوتا تھا ، اس لیے جب کوئی آپ کے حالات طلب کرتا تو آپ فوق صاحب ہی کا حوالہ

دیتے تھے - چنانچہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں :

''ڈیر فوق ! آپ آج کل لاہور میں ہیں یا امیرا کدل میں ؟ ایک دفعہ آپ نے 'کشمیری میگزین' میں میرے حالات شائع کیے تھے - اگر اس نمبر کی کوئی کاپی آپ کے پاس رہ گئی ہو تو ارسال فرمائیں - پھر واپس کر دی جائے گی - اگر آپ کے پاس نہ ہو تو کہیں سے منگوا دیجیے -''

فوق صاحب کی تصانیف اور 'اخبار کشمیری' کی خدمات سے خوش ہو کر اقبال ہمیشہ انھیں ''مجددِ کشامرہ'' کہا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''اگر آپ کے قلم کے زور سے کشمیر کے باشندوں اور پسماندہ مسلمانوں میں کچھ زندگی پیدا ہو گئی تو یہی خدمت آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے گی -''

تصنیف و تالیف کی ابتدا میں فوق صاحب نے ۲۰ اگست ۱۹۰۰ء کو ایک چھوٹی سی کتاب ''امتحان میں پاس ہونے کا گر'' شائع کی جس پر اقبال نے نظر ثانی کی اور بہت سی مفید باتوں کا اس میں اپنی طرف سے اضافہ بھی کیا - یہ کتاب اب بالکل نایاب ہے لیکن حسن اتفاق سے مجھے اس کا ایک نسخہ مل گیا ہے - اس پر اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے :

''یہ مختصر سا رسالہ ان ضروری ہدایات کا مجموعہ ہے جن کا جاننا طلباء کے لیے از بس مفید ہے - علاوہ ان ہدایات و ارشادات کے جو اُمیدواران امتحاناتِ یونیورسٹی کے لیے ضروری ہیں ، مؤلف نے اپنے رسالے کو انگریزی مصنفین کے بعض قابلِ قدر مقولوں سے آراستہ کیا ہے جس سے اس چھوٹی سی کتاب کی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے -

میرے خیال میں اس قسم کی کتابوں کا بچوں کے ہاتھوں میں دینا اخلاقی تعلیم کی بنیاد کو بہت استحکام دے گا۔

دستخط شیخ محمد اقبال

میکلوڈ عربک پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور''

اس کے بعد فوق صاحب نے 'بہار گلشن' کے نام سے غزلوں کے چند مجموعے چھاپے جن میں اقبال کی کئی غزلیں ان کی اجازت سے درج کیں اور ان کے مختصر سے حالات بھی لکھے۔ جلد دوم کا ایک رسالہ میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں اقبال کی چار غزلیں درج ہیں جن میں سے ایک غزل کے چند شعروں کے سوا کوئی علامہ کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ یہ ابتدائی غزلیں اگرچہ کوئی خاص شان نہیں رکھتیں لیکن درخشاں مستقبل کا ضرور پتہ دیتی ہیں۔ ان غزلوں کے چند شعر یہ ہیں:

تم آزماؤ 'ہاں' کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ 'وصال' کے

کم بخت اک 'نہیں' کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ 'وصال' کے

ہم موت مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے کسی نے اور ہی معنی 'وصال' کے

اے ضبط ہوشیار مرا حرفِ مدعا
قابو میں آ نہ جائے زبانِ سوال کے

مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کر
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے

ان کی گلی میں اور کچھ اندھیر ہو نہ جائے
اے ضعف دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے
میں نے کہا کہ بے دہنی اور یہ گالیاں ؟
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
کہتے ہیں ہنس کے ، جائیے ہم سے نہ بولیے
قربان جاؤں طرز بیان ملال کے
بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے تھے تم تو کسی بے مثال کے
کہتا ہے خضر دشت جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے
اقبال لکھنؤ سے ، نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اسی غزل کے ایک شعر پر مرزا ارشد گورگانی پھڑک اٹھے تھے اور اسی سے اقبال کی شہرت کو پرِ پرواز لگے تھے -

دوسری غزل :

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا
دمِ آفرینش ہدایت تھی دل کو
کلیمِ تماشائے ہر طور رہنا
سکھائی ہے کس نے تمھیں بے حجابی
حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا

تمھیں کیا بتائیں محبت ہے کیا شے
یہ ہے دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا
دکھاوے کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑے کام آیا مجھے دور رہنا
نبھائیں گے کیا ایک سے وہ محبت
جنھیں ہر نظر میں ہے منظور رہنا
نہیں عشق بازی یہ زاہد تو کیا ہے
اسیرِ خمِ گیسوے حور رہنا
کوئی چال اس خاکساری میں ہوگی
تمھاری تو عادت تھی مغرور رہنا
نہ میں تم کو دیکھوں نہ اغیار دیکھیں
مری آنکھ میں صورتِ نور رہنا
نہ ہو جن کی آنکھوں میں تابِ نظارہ
بھلا ان غریبوں سے کیا دور رہنا
وہ سو ناز اقبال پر کر رہے ہیں
زمانے میں ہے ان کو مشہور رہنا

اقبال کی اس غزل پر اس زمانے کے نقادوں نے کڑی تنقید کی جس کا جواب ان کے دوستوں نے 'اخبار پنجۂ فولاد' لاہور میں دیا مگر اقبال نے اس غزل کو قلم زد کردیا۔

تیسری غزل کے چند شعر یہ ہیں:

تم نے آغاز محبت میں یہ سوچا ہوگا
کس طرح کا یہ نیا چاہنے والا ہوگا
تم نے سمجھا تو ہے اس گھر کو ہمارا لیکن
اب ہمارا ہے، کوئی دن میں تمھارا ہوگا

حشر میں کچھ تو تمھیں حسن پہ ہوگی امید
کچھ مرا شکوہ نہ کرنے کا بھروسا ہوگا
گھر میں بیٹھے ہیں خدا رکھے کہ باہر ہیں کہیں
نامہ بر یہ بھی کسی نے تجھے پوچھا ہوگا
نامہ بر کام تو باتوں میں بنا کرتے ہیں
مان جائیں گے اگر تجھ کو سلیقا ہوگا
ہاں سنا پہلے ہمیں ان کو کہے گا کیا کیا
نامہ بر ہم جو بتائیں وہی کہنا ہوگا
ہم کہیں جائیں کسی کام کو جائیں، لیکن
دل یہ کہتا ہے اسی رہ سے گزرنا ہوگا
تیرے اشعار میں اقبال یہ رنگت تو نہ تھی
تو نے کم بخت کسی شوخ کو تاکا ہوگا

چوتھی غزل کے 'بانگِ درا' میں صرف چھ شعر درج ہیں اور جس ترتیب سے ہیں اسی طرح نمبر دیے گئے ہیں :

(۱)

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
ٹھہرتا ذرا، سن کے کم بخت آتا
وہاں نامہ بر آج تکرار کیا تھی

(۲)

تمھارے پیامی نے سب راز کھولے
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

مرا دل بھی اٹھنے کو چاہا نہ واں سے
فسوں تھا کوئی بزم اغیار کیا تھی
کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر
قیامت تھی ، بجلی تھی ، رفتار کیا تھی
یہ وعدہ کسی نے کیا کیا سمجھ کر
مری بزم بھی بزم اغیار کیا تھی
نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو
مری طرح بس یہ بھی وفادار کیا تھی

(۳)

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی
چھپائی ہے زاہد کوئی چیز تو نے
یہ شے ، تیرے قرباں ! مرے یار کیا تھی
ترے ساتھ اڑتی گئی رہ گزر میں
مری خاک اے دامنِ یار کیا تھی

(۴)

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

(۵)

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

قفس میں ہے بلبل تو ویران چمن ہے
یہی رونقِ رنگِ گلزار کیا تھی
ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں
الٰہی وہ چشمِ فسوں کار کیا تھی
لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں
کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

(۶)

سلیقہ نہ تھا بات کرنے کا تم کو
مجھے یاد ہے میری سرکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
کوئی سحر تھا تیری گفتار کیا تھی

فسوں تھا کوئی

بہار گلشن کے گلدستوں کی چند دوسری غزلیں شیخ عبدالرحمٰن طارق کی کتاب ''جہانِ اقبال'' میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

''بہارِ گلشن'' میں چھپے ہوئے حالات سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر اقبال نے جو دلگداز مرثیہ ''اشکِ خونیں'' کے نام سے لاہور کے ایک ماتمی جلسے میں پڑھا تھا، اس کی مقبولیت دیکھ کر حکومت پنجاب نے اس کی کئی ہزار کاپیاں اپنے صرف سے چھپوائی تھیں۔ اس وقت آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم مقام پروفیسر تھے۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک مطبوعہ کاپی میرے پاس بھی موجود ہے۔

انھی دنوں میلہ چراغاں کے موقع پر فوق صاحب نے چوبیس صفحوں کی ایک چھوٹی سی کتاب ''شالامار باغ لاہور کی سیر'' لکھ

کر شائع کی جو اس وقت اگرچہ اس سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی کہ بس لکھی گئی تھی ، تاہم چونکہ ایک اچھوتی چیز تھی اس لیے اسی میلے میں ہاتھوں ہاتھ بک گئی تھی ۔ بعد میں جدید تحقیقات کی روشنی اور تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے آپ نے اس ابتدائی کوشش کی ہیئت کو بدل کر ایک ٹھوس تاریخی کتاب بنا دیا ۔ چنانچہ سرورچرڈ ٹمپل کے رسالہ ''انڈین آرکیالوجیکل'' بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ع میں مصر کے ایک انگریز کپتان کرسول نے اپنے مضمون میں اس کتاب کو تاریخِ پنجاب کا ایک اہم جزو قرار دیا ہے ۔ بہر حال ۱۹۰۱ع میں جب تاریخ شالامار باغ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اقبال نے قطعۂ تاریخ کے یہ دو شعر کہے :

حسنِ سعیٔ فوق را صد مرحبا
هست ہر سطرِ کتابش دلربا
از سر نازش پئے تاریخ او
ن = ۵۰
می سزد تصویر باغ جانفزا

۵۰ + ۱۸۵۱ = ۱۹۰۱ع

''تصویرِ باغِ جانِ فزا'' کے اعداد ۱۸۵۱ع ہیں ۔ ان میں لفظ ''نازش'' کے حرفِ نون کے ۵۰ عدد شامل کرنے سے کتاب کا سنہ طباعت ۱۹۰۱ع برآمد ہوتا ہے ۔

۱۹۰۴ع میں فوق صاحب نے لاہور کے ہندو مسلمان صوفیوں اور بزرگوں کا تذکرہ ''یاد رفتگاں'' کے نام سے شائع کیا ۔ اس کتاب کے مقدمے میں یہ بحث چھیڑی گئی ہے کہ راگ اور سرود و سماع جائز ہے یا نہیں ، اگر جائز ہے تو کن صورتوں میں اور راگ سننے اور سنانے والے کون اور کس خیال کے ہونے چاہییں ، نیز گانا کس

مضمون پر اور حاضرینِ مجلس کے اخلاق و عادات کیسے ہونے چاہییں ؟ اور اقبال کے اس شعر پر آخری فیصلہ کیا گیا ہے :

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبال
راگ ہے دین مرا ، راگ ہے ایماں میرا

اقبال نے جب یہ کتاب دیکھی تو فوق صاحب کو لکھا :

''ڈیر فوق !

اہل اللہ کے حالات نے ، جو آپ نے بنام ''یاد رفتگاں'' تحریر فرمائے ہیں ، مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض بعض باتوں نے ، جو آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں ، مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا ۔ خدا کرے آپ کی توجہ اس طرف لگی رہے ۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ ان لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حسنِ ظن کا دور ہو جانا ہے ۔

بھائی فوق ! خود بھی اس گوہر نایاب کی تلاش میں رہو جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے ۔

والسلام

آپ کا دوست

محمد اقبال ایم ۔ اے ۔

(پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور)

از سیالکوٹ ۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء''

اسی کتاب سے متاثر ہو کر اقبال نے مندرجہ ذیل غزل کہی تھی جس کے بعض اشعار میں کم و بیش وہی تخیلات جھلک رہے ہیں

جو خط میں ظاہر کیے گئے ہیں :

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی ! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنّا درد دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھی خلوت گزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

ستمبر ۱۹۰۹ء میں فوق صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ 'کلام فوق' شائع ہوا ۔ اقبال نے 'کمال نضر فوق' سے اس کی تاریخ نکالی اور کلام کے محاسن کا اعتراف ان اشعار میں کیا :

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعۂ اشعار
معلوم ہوا مجھ کو بھی حالِ نضرِ فوق
شستہ ہے زباں ، جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نضرِ فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہوئی اقبال
ہاتف نے کہا لکھ دے کمالِ نضرِ فوق

۱۳۲۷ھ

یہاں 'نضر' بفتحِ نون تروتازگی اور زیبائی وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - بعض دوستوں نے اسے 'نظر' پڑھا ہے جس سے سو عدد بڑھ جاتے ہیں اور تاریخ غلط ہو جاتی ہے - دیکھیے فرہنگ آنندراج ، جلد ۳ ، ص ۵۸۲ - نیز تسہیل العربیہ ، ص ۸۵۸ - لغات کشوری ، ص ۵۹۹ -

۶ مئی ۱۹۱۷ع کو فوق صاحب نے کتاب "رہنمائے کشمیر" شائع کی جس میں کشمیر کے دلچسپ تاریخی و جغرافیائی حالات اور قابل دید مقامات کا تذکرہ ہے - اقبال نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کی خوبیوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا :

"ڈیر فوق ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے - کشمیر اور اہلِ کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے - البتہ کشامرہ کی قبر پرستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے اب تک کچھ نہیں لکھا - اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے -

رسالہ 'رہنمائے کشمیر' جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے نہایت مفید اور دلچسپ ہے - طرزِ بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا - افسوس ہے میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا لیکن امسال ممکن ہے آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچ لے جائے -

مخلص

۸ جون ۱۹۱۷ع — محمد اقبال"

'رہنمائے کشمیر' نے کشمیر دیکھنے کا جو شوق پیدا کیا تھا وہ اس سال تو پورا نہ ہوا ، البتہ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں آپ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی شیخ طاہر دین کے ہمراہ کشمیر تشریف لے گئے اور وہاں کے خستہ حال لوگوں کو جس حال میں دیکھا اس کا اظہار آپ نے 'پیامِ مشرق' کی بعض نظموں میں کیا ۔ چند شعر یہ ہیں :

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے
نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے
ازاں می فشاں قطرۂ پر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اقبال کے سفرِ کشمیر کی مفصل روئداد میرے مضمون 'اقبال اور کشمیر' مطبوعہ مجلہ اقبال بابت اکتوبر ۵۶ء میں ملاحظہ فرمائیے ۔

۱۹۲۰ء میں فوق صاحب نے اپنی کتاب 'تاریخ حریتِ اسلام' شائع کی ۔ یہ دراصل احرار اسلام کا ایک پُرجوش تذکرہ ہے جسے اقبال کے اس شعر کی تفسیر سمجھنا چاہیے :

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس کتاب میں زمانۂ رسالت و خلافتِ راشدہ سے لے کر عہدِ حاضر تک

کے تمام ممالک اسلامی کے حق گو اور حق پرست مردوں اور عورتوں کے جرأت آفریں اور حریت آموز حالات درج ہیں ۔ اقبال کو اس تصنیف کا حال معلوم ہوا تو آپ نے لکھا :

"ڈیر فوق ! السلام علیکم

دونوں کتابوں کا پیکٹ ابھی ملا ہے ، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ نے "تاریخِ حریتِ اسلام" بھی لکھی ہے ۔ یہ کتاب لاجواب ہوگی اور مسلمانوں کے لیے تازیانے کا کام دے گی ۔ آپ بڑا کام کر رہے ہیں ۔ اس کا اجر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے ملے گا۔

والسلام

محمد اقبال

لاہور ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ع"

فوق صاحب نے کتاب بھیجی ۔ اقبال نے پڑھی اور بے حد پسند کی ۔ آپ نے اس کتاب کو فوق صاحب کی بہترین تصنیف قرار دیا اور اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :

"فوق صاحب کو اسلامیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے ۔ اس سے پہلے آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں ۔ لیکن حق یہ ہے کہ 'حریتِ اسلام' آپ کی بہترین تصنیف ہے ۔ دلیری اور بے باکی سے اعلانِ حق کرنا گزشتہ مسلمانوں کی سیرت کا ایک نمایاں پہلو تھا ۔ مگر افسوس کہ عصرِ حاضر کے عام مسلمان تاریخ اسلام سے بالکل بے بہرہ ہیں ۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ بھی موٹے موٹے واقعات سے بے خبر ہیں ۔ ان حالات میں فوق صاحب کی تصنیف پنجاب کے اسلامی

لڑیچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی مسلمان خاندان اس بیش بہا کتاب کے مطالعے سے محروم نہ رہے گا۔ اسلامی سکولوں اور کالجوں کے کتب خانے خاص طور پر اس کے مطالعے کی طرف توجہ کریں۔ اس زمانے میں جب کہ جمہوریت کی روح ہندوستان میں نشو و نما پا رہی ہے، دیگر اہلِ ملک کے لیے بھی یہ کتاب سبق آموز ہوگی۔"

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں فوق صاحب بعض کتابوں کا مسالہ جمع کرنے کے لیے بھوپال گئے تھے کہ ۸ نومبر کو یک لخت لاہور سے ان کے گیارہ سالہ فرزند ظفر احسن کے انتقال کی خبر گئی۔ فوق صاحب اسے تندرست چھوڑ کر گئے تھے۔ اس حادثے نے غریب الوطنی میں انھیں خون کے آنسو رلائے۔ چنانچہ ۱۱ نومبر کی شام کو جب وہ بھوپال سے واپس آ رہے تھے تو دہلی کے قریب بلب گڑھ کے اسٹیشن پر یہ شعر بے ساختہ ان کی زبان پر آ گیا:

کچھ لڑکے چلے آتے ہیں اسکول سے پڑھ کر
دیکھو کہیں ان میں مرا احسن تو نہیں ہے

اس پر راستے میں ایک دلگداز مرثیہ مرتب ہو گیا۔ لاہور پہنچتے ہی فوق صاحب نے اقبال کو اس حادثے کی اطلاع دی۔ اپنی نئی کتاب 'شباب کشمیر' کی تجویز سامنے رکھی اور آپ کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ چھاپنے کی اجازت مانگی جس کے جواب میں اقبال نے لکھا:

"ڈیر فوق صاحب! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ کے مصائب کا حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ ان کو اپنے بیٹے کے قتل کیے جانے کی خبر ملی - ایک منٹ تامل کیا ، پھر طلباء کو مخاطب کر کے کہا : ''ما برضائے او راضی ہستیم بیائید کہ کار خود بکنیم -'' یہ کہہ کر پھر درس میں مصروف ہو گئے - مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے -
''شبابِ کشمیر'' ضرور لکھیے - بہت مفید کتاب ہوگی - اس کتاب کی سخت ضرورت ہے - کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی روح پیدا کی جائے - میں نے بھی ایک نظم اس مضمون پر لکھی ہے جو عنقریب فارسی مجموعے (پیامِ مشرق) میں شامل ہوگی - افسوس ہے کہ مجھے تاریخِ کشمیر سے بہت کم آگاہی ہے - ممکن ہے کہ پنڈت شیونرائن شمیم آپ کی مدد کر سکیں - ''راج ترنگنی'' غالباً ان کے پاس ہے - اگر نہ ہوئی تو پنجاب پبلک لائبریری میں ضرور مل جائے گی -
''اسلام میں سیاست'' چودہ سال ہوئے انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا یعنی ۱۹۰۸ع میں جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا جس کا نتیجہ آخرکار ۱۹۰۹ع میں سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی میں ظاہر ہوا - یہ مضمون لندن کے ''سوشیالوجیکل ریویو'' میں شائع ہوا تھا - ''پیسہ اخبار'' نے اس کا ترجمہ بہت غلط شائع کیا ہے - صحیح ترجمہ ''زمیندار'' میں شائع ہوا تھا - یہ ترجمہ جو چوہدری محمد حسین صاحب ایم - اے سیکرٹری نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب نے کیا تھا ، معتبر ہے - اگر آپ چھاپنا چاہیں تو بڑی خوشی

سے پمفلٹ فارم میں شائع کریں - مجھے کوئی اعتراض نہیں - البتہ چوہدری صاحب سے بھی اجازت لے لیں تو بہتر ہے - وہ ایک آدھ دن تک سیالکوٹ جانے والے ہیں - وہاں سے جنوری کے شروع میں واپس آ جائیں گے - ان کو اجازت دینے میں مجھے یقین ہے تامل نہ ہوگا - انگریزی مضمون چند روز ہوئے 'مسلم آؤٹ لک' میں چھپا تھا - وہ مطلوب ہو تو 'مسلم آؤٹ لک' سے مل سکتا ہے -

باقی رہے میرے حالات ، سو ان میں رکھا کیا ہے - میری طرزِ رہائش مشرقی ہے - آپ جب چاہیں شوق سے تشریف لا سکتے ہیں -

محمد اقبال

لاہور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ع"

یہ مضمون ۲۳ مارچ ۱۹۲۳ع کو ''خلافتِ اسلامیہ'' کے نام سے فوق صاحب نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا - اس میں بتایا گیا ہے کہ جمہوریت اسلام اور آئین انتخاب خلیفہ مذہب و سیاست کا مشترک اور واحد مطمح نظر ہے -

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی سال فوق صاحب نے سوانح ملک العلماء علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ، تاریخ سیالکوٹ اور مشاہیر سیالکوٹ لکھنی شروع کی - اس سلسلے میں انھوں نے پہلے اقبال کے استاد شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی سے کچھ استفسارات کیے - انھوں نے بعض کتابوں کے نام بتائے اور بعض شاعروں کا پتہ دیا جو سیالکوٹ کے تھے - پھر فوق صاحب نے مولانا کا خط اقبال کی خدمت میں بھیج کر

استدعا کی کہ اس بارے میں جو کچھ انھیں معلوم ہے وہ بھی لکھیں تاکہ کتاب کا کوئی پہلو کمزور نہ رہ جائے اور جہاں تک ہو سکے مکمل ہو ۔ اقبال نے جواب میں لکھا :

"ڈیر فوق ! السلام علیکم

مخدومی جناب مولوی صاحب (شمس العلماء مولوی میر حسن) نے جو نام لکھے ہیں ان میں سے میں کسی کو نہیں جانتا ، سوائے عشق پیچہ شاعر کے جو کوئی شاعر نہ تھا ، ہاں 'تک بند ضرور تھا ۔ سیالکوٹ کے مشہور قدیم شعرا میں سے شیخ محمد علی راجؒ[1] تھے ۔ ان کا دیوان فارسی میں بہت ضخیم میں نے خود دیکھا ہے ۔ غالباً شاہ جہاں یا عالمگیر کے عہد میں تھے ۔ ٹیک چند نے 'بہارِ عجم' میں جابجا ان کے اشعار کو محاوراتِ فارسی کی سند میں لکھا ہے ۔ ایک شعر ان کا مجھے بھی یاد ہے :

از جوانے سروقد دیگر بہ ہند افتادہ ام
دوستاں رحمے کہ از بامِ بلند افتادہ ام

غالباً کسی نہ کسی تذکرے میں ان کا ذکر ضرور آپ کو مل جائے گا ۔ مولوی صاحب قبلہ میر حسن صاحب کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے ، میری کوئی نظم نہیں ہے ۔ شاید کوئی شعر اشارۃً کسی نظم میں ہو ۔

والسلام

محمد اقبال

۴ مارچ ۱۹۲۳ع"

۱۔ شیخ نہیں ، میر محمد علی راجؒ ہونا چاہیے ۔ ان کے حالات خزانۂ عامرہ ، تذکرہ سرخوش اور نشتر عشق وغیرہ میں مل سکتے ہیں ۔ سیالکوٹ مل وارستہ ان کے شاگردوں میں تھا ۔ وہ ۱۱۵۰ھ میں فوت ہوئے ۔

جب اس کتاب کا مسودہ مکمل ہو کر اقبال کی نظر سے گزرا تو آپ نے ان الفاظ کے ساتھ اسے اہل علم کے سامنے پیش کیا :

''مولوی عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے جو شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں اسلامی امور کی ایک مشہور درسگاہ تھی - ان کی عالمگیر شہرت آخر شاہ جہاں تک پہنچی جس نے ان کی قدرافزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا - دربار دہلی میں بادشاہ کے اشارے سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مذہبی و فلسفیانہ مباحثے کرتے تھے جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں وسط ایشیا اور ایران کے حکما کو محوِ حیرت کیا کرتی تھیں - ان کی فلسفیانہ تصانیف میں ''سیلکوتی علی التصورات'' ایک مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر میں شائع ہوا تھا - اس کے علاوہ ان کی اور بھی کتابیں ہیں جو اسلامی ممالک میں بہت مشہور اور ہر دلعزیز ہیں - توحید باری تعالیٰ پر بھی ان کا ایک خاص رسالہ جو شاہ جہاں کی فرمائش سے لکھا گیا تھا ، میری نظر سے گزرا ہے مگر غالباً آج تک شائع نہیں ہوا - اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصہ اب تقویمِ پارینہ ہے ، لیکن اسلامی فلسفے کا مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا - سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب اب تک ان کی یادگار ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کا مزار جو تالاب کے قریب ہی واقع ہے ، نہایت کس مپرسی کی حالت میں اہلِ سیالکوٹ کی بے حسی اور مردہ دلی کا گلہ گزار ہے -

منشی محمد الدین صاحب فوق نے ، جن کی تاریخی کرید مشہور

ہے مولانا مرحوم کے حالاتِ زندگی لکھ کر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی ۔

اس رسالے میں ضمناً سیالکوٹ شہر کے تاریخی حالات بھی ہیں جو نہایت تجسس اور تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں ۔ اہلِ سیالکوٹ کو ان حالات سے بالخصوص دلچسپی ہوگی ۔

محمد اقبال

۳ دسمبر ۱۹۲۸ء"

میرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے :

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کچھ اسی قسم کا معاملہ فوق صاحب کو بھی پیش آیا ۔ آپ کشمیر میں تھے کہ آپ نے خواب میں اقبال کو دوزخ میں دیکھا ۔ خیال کیا آپ کسی تکلیف میں مبتلا ہیں ۔ انھوں نے اپنے خواب کی پوری کیفیت لکھ کر خیریت دریافت کی ۔ پیغمبرِ دینِ خودی نے اسرار کے پردے ہٹا کر اس خواب کی تعبیر کی اور فوق صاحب کی تشویش رفع کرتے ہوئے لکھا :

"ڈیر فوق صاحب ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ الحمدللہ کہ تاحال ہر طرح خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ اگر آپ نے خواب میں مجھے دوزخ میں دیکھا ہے تو یہ بالکل صحیح ہے ۔ کیونکہ لاہور آج کل دوزخ سے کم نہیں ۔ باقی خیریت ہے ۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا ۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

لاہور ۳۰ جون ۱۹۲۸ء"

۱۹۲۸ء میں فوق صاحب کی کتاب 'شباب کشمیر' شائع ہوئی۔ کوئی مستقل تصنیف تو نہ تھی۔ فوق صاحب کشمیر کے سب سے ہر دلعزیز بادشاہ زین العابدین عرف بڈشاہ کے حالات کئی سال سے جمع کر رہے تھے اور اس عہد کی مبسوط تاریخ لکھنا چاہتے تھے جو ۱۹۴۴ء میں ''تاریخ بڈشاہی'' کے نام سے پایۂ تکمیل کو پہنچی اور اس کی اشاعت پر حکومت کشمیر نے فوق صاحب کو ایک ہزار روپیہ انعام عطا کیا۔ ''شباب کشمیر'' دراصل ''تاریخ بڈشاہی'' کا پیش خیمہ تھی۔ بڈشاہ نے اٹھارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھ کر پچاس برس سے زیادہ عرصے تک حکومت کی اور ۸۷۴ھ میں ۶۹ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ وہ بڑا خلیق، بیدار مغز، صلح کل، عدل گستر، فیاض، علم دوست اور معارف پرور شہنشاہ تھا۔ اس نے اکبر اعظم سے ۷۰ برس قبل اپنے ملک میں متحدہ قومیت کی بنیادی رکھی اور ہندو مسلمانوں کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اس کے کاروبارِ سلطنت میں دونوں قوموں کے بہترین دماغ برابر کے شریک تھے۔ عام ہندو رعایا اس کی بلائیں لیتی اور اسے ''بٹ شاہ'' یعنی ہندوؤں کا بادشاہ کہتی تھی۔ مسلمان اس پر جان فدا کرتے اور اسے ''بڈشاہ'' یعنی بڑا بادشاہ کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اس کے عدل و انصاف کے قصے دور دور تک مشہور تھے۔ اس کے فیضِ کرم سے دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب و ملت کے کشمیری اس کے کارناموں پر فخر کرتے اور آج تک اس کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ اس کے زریں عہد کو کشمیر کے شباب کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

کتاب ''شباب کشمیر'' سے اس وقت کی علمی، ادبی، سیاسی، روحانی، صنعتی، تجارتی، معاشرتی اور تمدنی ترقیوں کی کیفیت آنکھوں

کے سامنے آ جاتی ہے - اقبال پہلے ہی اس کتاب کی تجویز کو پسند فرما چکے تھے ، بلکہ اس کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے - آپ نے جب کتاب دیکھی تو فرمایا :

''آپ کی کتاب ''شباب کشمیر'' کشمیر کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے - مجھے یقین ہے کہ عام لوگ بالخصوص اہالیانِ کشمیر اسے شوق سے پڑھیں گے - اس سے پہلے بھی جو لٹریچر آپ نے کشمیر کے متعلق پیدا کیا ہے ، میرے نزدیک بہت مفید اور آپ کے علمی ذوق اور حبِ وطن پر شاہدِ عادل ہے -''

اپریل ۱۹۲۹ء میں فوق صاحب کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا تو اقبال نے تعزیت کا خط لکھا - یہ خط ۲۰ اپریل ۱۹۲۹ء کا ہے - یہی سب سے آخری تحریر ہے جو اقبال کی طرف سے موصول ہوئی - اس میں اقبال نے لکھا :

''ڈیر فوق صاحب ! السلام علیکم

اخبار انقلاب میں آپ کی اہلیہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا - خدا تعالیٰ مرحومہ کو جنت عطا فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل - تقدیر الٰہی سے کوئی چارہ نہیں - مسلمانوں کے لیے تسلیم کے سوا اور کوئی راہ نہیں اور یہی راہ انسب و اولیٰ ہے - والسلام

محمد اقبال''

فوق صاحب افسوس کیا کرتے تھے کہ آخری ایام میں اقبال سے ملاقات نہ ہو سکی - ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ایک شام کافی مدت کے بعد ان کی نئی کوٹھی جاوید منزل میں ان سے ملنے گئے تھے - اس وقت وہ بیمار تھے - کوٹھی کے باہر چارپائی پر بیٹھے خان

غلام رسول خان بیرسٹر اور دو اور اصحاب سے اسلامیہ کالج کی پرنسپلی کے متعلق باتیں کر رہے تھے - آواز بہت باریک اور کمزور تھی - فوق صاحب السلام علیکم کہہ کے بیٹھ گئے - قریباً نصف گھنٹہ بیٹھے رہے لیکن ان سے مخاطب نہیں ہوئے - چونکہ فوق صاحب ان دنوں کشمیر ایسوسی ایشن کے سیکریٹری تھے جو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے کھنڈروں پر قائم ہوئی تھی جس میں احمدی جماعت کا بھی کافی اثر تھا ، اس لیے انھوں نے خیال کیا کہ شاید اقبال ان سے کچھ ناراض ہیں - سلام کرکے چلے آئے - لیکن جنوری ۱۹۳۷ع فوق صاحب کے چچا منشی غلام محمد خادم ان کی ملاقات کو گئے تو اقبال انھیں پہچان نہ سکے - پوچھا ''آپ کون ہیں ؟'' جب خادم صاحب نے اپنا نام بتایا تو فرمایا ''میری نظر کمزور ہے - میں پہچان نہ سکا'' پھر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا : ''فوق کہاں ہے ، ایک سال سے نہیں ملا -'' انھوں نے کہا ''وہ بیمار ہیں اس لیے میرے ساتھ نہیں آ سکے - مئی ۳۶ع کی شام کو آئے تھے ، آپ نے ان سے کوئی بات نہیں کی ، وہ دل شکستہ ہو کر واپس چلے گئے -'' اقبال نے کہا ''مجھے ضعفِ نظر کی شکایت ہے - میں تو آپ کو بھی نہ پہچان سکا -''

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع کو اقبال کی وفات کے دن بھی فوق صاحب بیمار تھے - ان کو سخت بخار تھا - اس لیے جاوید منزل تک نہ جا سکے ، لیکن اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ تک چلے آئے جہاں تمام لوگ جمع تھے - وہاں سے جنازے کے ہمراہ بادشاہی مسجد تک گئے اور جب تک انھیں سپردِ خاک نہ کر دیا گیا وہاں سے نہ ہلے - پھر جب زندہ رہے ان کا ماتم کرتے ان کی یاد سینے سے لگائے رہے - دیکھیے ایک غزل میں ان کی مفارقت کا ذکر کس حسرت سے کرتے ہیں :

اجل اس مردِ حق آگاہ کو بھی لے گئی یارب
حقیقت کا جسے بھیجا بنا کر ترجماں تو نے
ہوئے جس سے اسرارِ خودی و بے خودی ظاہر
نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیرِ مغاں تو نے
کیا اے فوق چاک اقبال نے اسرار کا پردہ
جو باقی رہ گئے تھے کر دیے وہ بھی عیاں تو نے

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں:

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی
فطرتِ حق کا جسے کچھ رازداں سمجھا تھا میں
یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبرِ دینِ خودی
۱۹۳۸ع
یا چراغِ محفلِ ہندوستاں سمجھا تھا میں
۱۹۳۸ع

(مجلہ اقبال لاہور، اپریل ۱۹۶۰ع)

• • •

اقبال اور طریقت

بیا به مجلس اقبال یک دو ساغر کش
اگرچه سر نه تراشد قلندری داند

ابتدا ہی میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مضمون کے عنوان میں ''طریقت'' کا لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا، نہ اس مقالے میں اقبال کے فلسفۂ تصوف پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے گی۔ بلکہ اقبال کے ایما پر منشی محمد الدین فوق مرحوم نے جو رسالہ ''طریقت'' جاری کیا تھا، اس کے متعلق چند دلچسپ باتیں بیان کرنی مقصود ہیں، جن کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اقبال علیہ الرحمہ ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھنے اور اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے دلی عقیدت و ارادت رکھنے کے باوجود ایسے صوفیوں اور پیروں سے سخت متنفر تھے جو روحانیات میں ترقی کرنے کے بجائے اپنا پیشہ گرداوری بلکہ گداگری بنا لیتے ہیں اور اپنے مریدوں پر سالانہ ٹیکس لگا کر ان کا خون چوستے ہیں۔ وہ دوسروں کو تو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ دنیا مردار ہے، کافروں کے لیے ہے، مومنوں کو عیش و راحت بہشت میں ملے گی، لیکن خود دنیا طلبی میں مبتلا ہو کر محل کھڑے کرتے ہیں، عالی شان عمارتیں بنواتے ہیں اور جائدادیں خریدتے ہیں۔ چنانچہ علامہ کے کلام میں جابجا اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں:

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یا پھر:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

اور اس کی وجہ یہ تھی:

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
مُلّاؔ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

''شرابِ الست'' بے عملی کا بہانہ بنی اور مسلمان یہ کہہ کر کہ ''قسمت کا لکھا ہی ایسا تھا'' زندگی کی کشمکش سے بھاگ کھڑا ہوا اور جمود و خمود نے اس کے قوائے عمل پر اپنا تسلط جما لیا:

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

نتیجہ یہ ہوا کہ جس قرآنِ پاک کی تعلیم نے مسلمانوں کو مہ و پروین کا امیر بنا چھوڑا تھا، اب اسی قرآن مجید سے ترکِ جہاں کی تعلیم اخذ کی جا رہی ہے:

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غرض اقبال کی نظر میں مسلمان خود اپنے کو اور اپنے خدا کو فریب دے رہا ہے:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

خیر یہ باتیں تو محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں، مقصدِ بیان یہ ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے دوست منشی محمد الدین فوق مدیر 'اخبار کشمیری' لاہور سے کئی دفعہ کہا کہ اس قسم کا کوئی رسالہ جاری کریں، جس سے فرقۂ صوفیاء کی کوئی اصلاح ہو سکے۔ ان کی غلط تعلیم نے مسلمانوں کو مردہ دل بنا دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے سامنے ایسا اسلام پیش کرتے ہیں جس پر صدہا غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ جب یہ لوگ خود ہی اسلام کی روح سے واقف نہیں تو اپنے مریدوں کو کیا خاک تعلیم دیتے ہوں گے۔ ان کو راہِ راست پر لانے اور ان میں عشقِ الٰہی کی گرمی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

فوق صاحب نے اپنی مجبوریاں ظاہر کیں کہ مجھے ہفتہ وار 'اخبار کشمیری' سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ پھر یہ طبقہ ایسا ہوشیار ہے کہ وہ رسالے کے مضامین دیکھ کر ہوا کا رخ پہچان لے گا اور اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

اقبال نے فرمایا کہ اس کا علاج نہایت سہل ہے۔ شوگر کوٹڈ مضامین لکھیے۔ گڑ میں زہر ملا کر دیجیے اور اپنے آپ کو بالکل ان کا ہمدرد اور عقیدت مند ظاہر کر کے اس کام کو ہاتھ لگائیے۔ پھر یہ

آپ کی بات بھی سنیں گے اور آپ کے مشورے بھی قبول کریں گے۔ اس طرح کچھ خدمت بھی ہو جائے گی اور اصلاح کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ دیکھیے! مولانا روم کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک طرف مولوی اور واعظ شریعتِ حقہ کے مسائل بیان کرتے تھے، دوسری طرف مولانا روم اپنی مثنوی کا درس دیتے تھے۔ مثنوی میں بھی وہی باتیں ہوتی تھیں جو دوسرے واعظ سنایا کرتے تھے۔ لیکن مولویوں کے وعظ میں جہاں قال اللہ اور قال الرسول کا ذکر کھلے الفاظ میں ہوتا تھا، لوگوں کی جمعیت کم ہوتی تھی۔ مگر مولانا روم کے وعظ میں صدہا لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا روم نے وہ اصلاحی رنگ اختیار کیا تھا جسے لوگ جلد قبول کر سکتے تھے۔ انھوں نے قوم کی نبض دیکھ کر عوام کا مذاق تاڑ لیا تھا اور وہ اسی کے مطابق کتاب و سنت کے مسائل بیان کرتے تھے۔ برخلاف اس کے دوسرے لوگ خشک "ملا" تھے اس لیے ناکام رہتے تھے۔ آپ بھی اگر پیروں اور صوفیوں میں گھل مل جائیں گے تو وہ آپ کی بات سنیں گے، کڑوی کسیلی کا برا نہ مانیں گے اور آپ کے خلوص کی قدر کریں گے۔

آخر گفتار کے غازی نے کردار کے غازی کو قائل کر ہی لیا اور اگست ۱۹۰۸ء میں فوق صاحب نے رسالہ "طریقت" جاری کر دیا۔ پہلے پرچے میں ابوالاعجاز حضرت احسان شاہجہان پوری، خواجہ حسن نظامی دہلوی، لسان العصر اکبر الہ آبادی، خان احمد حسین خاں (مدیرِ شبابِ اردو)، مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی جیسے نامور بزرگوں کے مضامینِ نظم و نثر کے علاوہ ایک دلچسپ مکالمہ بھی شائع ہوا جو اقبال اور فوق کے درمیان ہے۔ یہ سب حضرات اب باقیات الصالحات میں

شامل ہو چکے ہیں ۔

فوق صاحب کے اپنے ادارتی مضمون کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے پرچہ نکالنے سے قبل حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر صوفیائے کرام ، تصوف ، مراسمِ عرس ، ضرورتِ مرشد اور زیارتِ قبور وغیرہ مسائل کے متعلق ان کے خیالات دریافت کیے تھے ۔ اقبال نے جو کچھ جواب میں ارشاد فرمایا تھا ، وہ بھی لکھ لیا تھا اور ان کی نظرثانی کے بعد رسالے میں درج کر دیا تھا ۔ اقبال نے اپنے جوابات میں حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں ۔ یہ شراب اگرچہ کسی قدر پرانی ہو چکی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے یہ زریں خیالات آج بھی ہر تعلیم یافتہ نوجوان کے غور و فکر کے قابل ہیں ۔ اس لیے میں فوق صاحب کے سوالات اور اقبال کے جوابات مذکورہ رسالے سے لے کر یہاں پیش کرتا ہوں :

بیا بہ مجلسِ اقبال یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

فوق : صوفیوں سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا ؟

اقبال : اہلِ تصوف خصوصاً ہندوستان کے صوفیائے عظام نے اسلام کو وہ رونق بخشی اور بجائے تیر و تلوار کے محض حسنِ عمل اور اخلاقِ محمدی کے ذریعے اس کی وہ اشاعت کی کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں چھ کروڑ یقیناً ان ہی بزرگوں کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہیں ۔

فوق : صوفیوں سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا ؟

اقبال : مسلمانوں کی اخلاقی زندگی پر صوفیائے کرام نے بہت بڑا اثر ڈالا ۔ تمام ایسے اوصاف جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں ، محض انھی بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہیں ۔

انھوں نے انسانوں کو انسان اور پھر مسلمانوں کو مسلمان بنایا۔

فوق : مسلم پالیٹکس کو ان سے کیا فائدہ ہوا ؟

اقبال : صوفیوں کا گروہ پولیٹیکل معاملات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس ، اصلاحِ باطن اور نفس کشی ہے۔ اس لیے اس نے ملکی الجھنوں میں بہت کم بلکہ بالکل دخل نہیں دیا۔ البتہ بعض سلاطین کو ، جو اپنے شاہانہ فرائض سے غافل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد کا باعث ہوتے رہے ہیں ، تادیبی ہدایات فرماتے رہے ہیں ، جیسا کہ تاریخوں کے مطالعے اور صوفیائے کرام کے حالات سے اکثر ظاہر ہوتا ہے۔

فوق : اسلامی تصوف دنیاداری کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے ؟

اقبال : اسلامی تصوف کی یہی تعلیم ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی رکھے۔ اسلام رہبانیت کے خلاف ہے اور گھر بار اور اہل و عیال کو ترک کرکے جنگلوں اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلامی تصوف ایسے یوگ کو ، جو صرف اپنی ذات کے لیے ہو ، ایک بے فیض اور خشک چشمے سے تشبیہہ دیتا ہے۔ بے شک یک سوئی حاصل کرنے کے لیے خلوت اور عزلت نشینی کی ضرورت ہے ، لیکن تمام لوگ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ دراصل ترکِ دنیا ایک برا نمونہ ہے اہلِ دنیا کے کاروبار کے لیے ، بلکہ صریح خلاف ورزی ہے الٰہی قانون کی ، جو انسانی نسل کے بڑھتے رہنے اور اس کے پھولنے پھلنے کا متمنی ہے۔

فوق : عُرس کی رسم کب سے جاری ہے ؟

اقبال : عرب اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کی تو خبر نہیں لیکن ہندوستان

کے عرسوں کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں چونکہ جاترا کی رسم عرصہ دراز سے چلی آتی ہے اور وہ دور دراز ممالک سے بعض خاص تیرتھوں کی جاترا کے لیے جایا کرتے تھے ، اس لیے جب وہ رفتہ رفتہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے ، تو ان کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے جو ان کے مذہبی اور قومی شعائر سے کسی قدر مشابہ تھے - یہ میرا قیاس ہے ، یقین نہیں ہے -

فوق : عرس کا مقصد کیا ہے ؟

اقبال : عرس کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ جس بزرگ کا عرس ہو ، اس کے سبق آموز حالات بیان کیے جائیں اور لوگوں کو اس کے اچھے عمل کی تقلید و پیروی کی ترغیب دی جائے لیکن افسوس ہے کہ موجودہ عرسوں کا بیشتر حصہ اپنے اصلی مقصد سے دور ہٹ چکا ہے اور محض بے خبر ہے -

فوق : صوفی لوگ موجودہ زمانے کی جد و جہد میں ہمارے لیے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں ؟

اقبال : اہلِ تصوف ، خصوصاً ان بزرگوں کا جو صاحبِ اثر ہیں اور اپنے عقیدت مندوں کا بہت بڑا حلقہ رکھتے ہیں ، یہ نہایت ضروری فرض ہے کہ وہ اپنے معتقدوں اور ارادت مندوں کو اپنے اثر میں رکھیں اور ان کی زندگی کو مذہبی اور اخلاق پہلو سے ایک کامیاب زندگی بنا دیں - سوشل ترقی کے لیے جد و جہد کرنا بھی ایک قسم کی بیداری ہے اور یہ بیداری جب کبھی ہوگی ، حضرات صوفیاء کے پاک نفوس ہی سے ہوگی -

فوق : اولیاء کی کرامتوں کے متعلق کیا خیال ہے ؟

اقبال : میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس ، جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص دل اور خاص دماغ عطا کیا ہے اور جو تزکیۂ نفس میں صاحبِ کمال ہیں ، تیر از کماں جستہ اور آب از جُو رفتہ واپس لا سکتے ہیں :

اولیــاء را ہست قــدرت از الٰــہ
تیرِ جستہ بــاز گردانــد ز راہ

فوق : قبروں پر جانا چاہیے یا نہیں ؟

اقبال : اگر مراد اس سے قبر پرستی ہے ، یعنی صاحبانِ قبور سے حاجات طلب کی جائیں جس طرح خدا کو حاضر جان کر کی جاتی ہیں ، تو میں اس کے سخت خلاف ہوں بلکہ اس کو سخت گناہ سمجھتا ہوں ۔ اور اگر قبروں پر جانے سے مطلب فاتحہ پڑھنا ، عبرت حاصل کرنا اور موت کو یاد کرنا ہے ، تو میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں ، بلکہ ایسا ضرور ہونا چاہیے ۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی قائل ہوں کہ قبرستانوں پر خصوصاً کسی صاحبِ دل کے مزار پر جانے سے صفائیِ باطن بھی حاصل ہو سکتی ہے ۔

فوق : پیر کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

اقبال : پیر یا مرشد کی ضرورت ہے ۔ اس کے بغیر انسان کوئی صحیح اور کامل راستہ نہیں دیکھ سکتا ۔ روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف ان ہی لوگوں کو ہوگا جو اہلِ دل ہیں ، جن کے دل میں درد ہے ، جن کے قلب میں گرمی اور جن کی روح میں تڑپ ہے ، لیکن کم سے کم اخلاق فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے ۔ پیر کی صحبت سے (بشرطیکہ

پیر دکانداری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے۔ اور جس کا اخلاق درست ہے، جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے اعمال اعمالِ حسنہ کہے جاتے ہیں اس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہو سکتا ہے۔

فوق : ازمنۂ سلف کے سے اب پیر کیوں نہیں ہوتے ؟

اقبال : اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی ان اوصاف سے معرّا ہے، جن سے ایسے نیک وجود پیدا ہو سکتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے عالم، فلاسفر اور موجد پیدا ہوتے ہیں، بلکہ دنیا کی کاروباری زندگی میں مشینوں، انجنوں اور نت نئی ایجادوں کے ذریعے جس قدر انقلاب ان لوگوں نے پیدا کیا ہے، اس نے تمام دنیا اور بالخصوص اہلِ ہند کو عالمِ حیرت میں ڈال دیا ہے، مگر اس پر کبھی غور بھی کیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے عالموں، فلاسفروں اور موجدوں کی طرح اور ممالک میں ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے ؟ اس کے جواب میں سوسائٹی کے تاثرات کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں علم و ہنر کا چرچا نہیں، جہاں دماغوں سے سوچنے اور غور کرنے کا کام نہیں لیا جاتا، وہاں ایک فلاسفر، ایک عالم اور ایک موجد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے ؟

لیکن بعض مستثنیات بھی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ دکھانے کے لیے بعض ایسے امور کا اظہار بھی کر دیتا ہے کہ سوسائٹی کا اثر بالائے طاق رہ جاتا ہے اور انسان کو اپنی عاجزی اور بندگی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً گوتم بدھ کا ایک بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا اور پھر

فقیری اختیار کر لینا - سوسائٹی کے اثر پر اگر غور کیا جائے تو گوتم کے گرد و پیش جس قسم کی سوسائٹی تھی، وہ دکھ، بیماری، فقر و فاقہ اور دردِ دل سے بالکل لاعلم اور عیش و عشرت اور تفریح و مسرت میں محو رہا کرتی تھی - ایک بادشاہ کا بیٹا دکھ محسوس کرتا ہے، ایک عالم کی تکلیفوں کو اپنی ذاتی تکلیف سمجھتا ہے اور اسی قلق سے مضطرب ہو کر سلطنت ترک کر دیتا ہے -

عرب جیسے جاہل اور آجڈ ملک میں، جہاں دنگہ فساد، خون خرابہ، لڑکیوں کا قتل اور دنیا جہان کے دیگر عیوب ایک معمولی بلکہ تفریح کی بات سمجھے جاتے تھے، وہاں ایک شخص درگاہ رب العزت سے اسی قسم کا غیر معمولی دماغ و دل لے کر آتا ہے، جو ایک عالم میں نہ مٹنے والا انقلاب اور دلوں سے نہ محو ہونے والی کیفیت پیدا کر دیتا ہے - میری مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا ایک روشن نمونہ تھے - ان کے گرد و پیش اور نواحیات میں جس قسم کے خیالات تھے، ان کا خاکہ مولانا حالی نے اپنی ایک نظم میں اتارا ہے -

مختصر یہ ہے کہ اہلِ عرب بات بات پر لڑتے تھے اور لڑائی کا سلسلہ صدیوں تک جاری رکھتے تھے - ایک خدا کی جگہ کئی کئی خدا اور اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے بت پوجتے تھے - شخصیت پرستی کا دور دورہ تھا - شراب اور خواہشات نفسانی کی گرم بازاری تھی - انصاف اور قانون کا نام و نشان نہیں تھا - ان حالات کی موجوگی میں ایسے رحمۃ للعالمین کے

وجودِ ذی جود کی کس طرح توقع ہو سکتی تھی ، جس نے عرب ـــ جاہل عرب ـــ کو وہ قابلِ فخر خطہ بنا دیا کہ آج تمام دنیا کے مسلمان سرزمینِ عرب کو دنیا کا بہترین اور افضل ترین ٹکڑا تصور کرتے اور مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں ۔

درحقیقت یہ ایک الٰہی قانون ہے کہ بڑے بڑے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں ان کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہوتی ۔"

اس مکالمے سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی تھیں جن کی آپ کے اشعار میں محض کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سی ملتی ہے ۔

رسالہ 'طریقت' کی علمی حیثیت چونکہ بہت بلند تھی ، اس لیے ملک کے گوشے گوشے میں اس کی پذیرائی ہوئی ۔ پیر سید جماعت علی شاہ مرحوم و مغفور محدث علی پوری کی وساطت سے پنجاب ، حیدرآباد دکن ۔ کشمیر اور میسور کے اکثر صاحبانِ اثر نے معقول امداد دی ۔ پیر سید محمد حسین سجادہ نشین آلومہار شریف نے حافظ جھنڈا مرحوم سکنہ گوجرانوالہ کو ، جن کی پنجابی نظمیں ان کی خوش الحانی کی وجہ سے مقبول عام تھیں ، فوق صاحب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر آپ ہمارے ہاں کے کچھ حالات چھاپ دیا کریں تو ہم سردست ایک سو خریدار دے سکتے ہیں ۔ آوان شریف والوں[1] سے بھی مدد ملی ۔ چشتیاں بہاولپور ، تونسہ شریف

---

۱ ۔ یہاں یہ بات شاید آپ کی معلومات میں اضافے کا باعث ہو کہ اقبال خود بھی لڑکپن سے سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود صاحب دربار آوان شریف (م : ۲ مئی ۱۹۱۹ع) کے مرید تھے جو سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے ۔

اور کپور تھلہ کے اہلِ دل حضرات نے بھی کافی خریدار دیے ۔

غرض تھوڑے ہی عرصے میں اس رسالے کی اشاعت دو ہزار تک پہنچ گئی ۔ عام لوگوں نے بھی اسے پسند کیا اور ہندو بھی خاصی تعداد میں اس کے خریدار بنے ۔ اقبال اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ فوق صاحب کاروبار میں مصروف رہنے کے باعث کچھ عرصہ ان کی ملاقات کو نہ جا سکے ۔ اس پر اقبال نے لکھا[1] :

"ڈیر فوق !

. . . آپ کبھی ملتے ہی نہیں ۔ اب تو آپ "پیرِ طریقت" بھی بن گئے ۔ خدا کرے جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورودِ کشمیر کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں ۔ والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال"

۲۳ جولائی ۱۹۱۵ء

پیر جماعت علی شاہ صاحب کا نام آ گیا تو لگے ہاتھوں فوق صاحب کے اپنے الفاظ میں ان کی چند صحبتوں کا ذکر بھی سن لیجیے جو دلچسپی سے خالی نہیں ۔ فرماتے ہیں :

"۱۹۱۵ء کا ذکر ہے ، میں انجمن اسلامیہ پونچھ کی دعوت پر پونچھ جانے والا تھا اور مولوی محمد عظیم گکھڑوی مرحوم کو بھی ان کی تحریری خواہش کے مطابق اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار کر رکھا تھا ۔ مولوی محمد عظیم میرے دوستوں میں تھے ، وعظ بہت اچھا کہتے تھے (مثنوی

۱۔ رسالہ نقوش ، مکاتیب نمبر ، جلد اول ، ص ۲۹۴ ۔ انوارِ اقبال ، ص ٦٠ ۔

خوب پڑھتے تھے) اور حضرت شاہ صاحب کے ممتاز مریدوں میں سے تھے - پہلے ہم دونوں کو جموں پہنچنا تھا - وہاں بھی انجمنِ اسلامیہ کا جلسہ تھا ، جہاں میری نظم تھی اور ان کا وعظ - وہاں گئے تو حضرت شاہ صاحب بھی اسی سلسلے میں تشریف فرما تھے - جلسے سے فارغ ہو کر میں نے مولوی محمد عظیم سے روانہ ہونے کو کہا - انھوں نے کہا میں تو حاضر ہوں لیکن حضرت صاحب سے اجازت کی ضرورت ہے - میں نے کہا اگر اجازت نہ ملی تو پھر ؟ وہ کھسیانے سے ہو گئے لیکن یہی کہا کہ آپ بھی حضرت صاحب سے ذکر کریں - میں نے ذکر کیا تو جواب ملا کہ سیالکوٹ تک تو چلو - غرض وہاں گئے مگر وہاں دعوتوں کی کثرت اور لوگوں کے آنے جانے کی وجہ سے کسی گفتگو کا موقع ہی نہ مل سکا - آخر ایک دن ہمت کرکے ان سے عرض کیا کہ پونچھ میں جلسے کا دن نزدیک آ رہا ہے - پرسوں تک وہ کھوٹہ میں ہمارے لیے سواری اور اپنے آدمی بھیج دیں گے اور یہاں کچھ عرض کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا - بات صرف اتنی ہے کہ پونچھ کے مسلمانوں کو ، جو اسلامی احکام و تعلیم سے بے خبر ہیں ، سیدھا راستہ بتانے کے لیے آپ کے ایک مرید کو ہمراہ لے جانے کی ضرورت ہے - فرمایا : اچھا صبح دیکھا جائے گا -

میں نے صوفی کرم الٰہی بی - اے وکیل سیالکوٹ سے ، جو شاہ صاحب کی انجمن خدام الصوفیہ کے سیکریٹری اور ان کے مرید خاص تھے ، اپنی روحانی تکلیف کا ذکر کرتے

ہوئے کہا کہ آپ ہی حضرت صاحب سے سفارش کریں ۔ آپ نے جواب دیا : میری تو اتنی جرأت نہیں ۔ میں نے پوچھا : آخر وجہ ؟ کہا : مرید ہو کے دیکھ لو ۔ میں نے کہا : ایسی مریدی سے باز آیا جو تھوڑی بہت جرأت اور رہی سہی آزادی کا بھی خاتمہ کردے ۔

اُس زمانے میں پسرور اور علی پور تک ریل نہ جاتی تھی ۔ لوگ اکّوں (یکّوں) پر آمد و رفت رکھتے تھے ۔ صبح ہوئی تو تقریباً چھ اکّے تیار دیکھے گئے جن پر حضرت صاحب کے مرید اور خادم مع اسباب وغیرہ سوار تھے ۔ لوگ اپنے مطالب و مقاصد کے لیے حضرت صاحب کے گرد جمع تھے اور یہ شور سنائی دے رہا تھا کہ حضرت ! میرے لیے بھی دعا فرمائیے ۔ حضرت صاحب دعا فرماتے اور وہ شخص ہاتھ چوم کر علیحدہ ہو جاتا ۔ جب سب لوگ ادھر اُدھر ہو گئے تو میں بھی حضرت صاحب سے ملا اور عرض کیا : حضرت میرے لیے بھی دعا فرمائیے ۔ فرمایا : کیا ؟ میں نے عرض کیا : بس یہی کہ خداوند کریم ، جو مقلّب القلوب ہے اور ایک پل میں دلوں کو پھیر سکتا ہے ، آپ کو یہ توفیق رفیق کرے کہ آپ میری خاطر نہیں ، مولوی صاحب کی خاطر نہیں بلکہ پونچھ کے پہاڑی خطے کے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کرنے کی خاطر مولوی صاحب کو پونچھ جانے کی اجازت عطا فرمائیں ۔ حضرت صاحب ہنس پڑے اور کہا : بہت اچھا ۔ مولوی صاحب ! آپ کو اجازت ہے ۔ آپ ان کے ساتھ ابھی روانہ ہو جائیں ۔ میں نے کہا : حضرت ! دیکھیے

اتنے لوگوں میں سب سے پہلا خوش نصیب میں ہی ہوں جس نے اپنی دعا کی مقبولیت یہیں کھڑے کھڑے دیکھ لی ۔''

ایک مرتبہ فوق صاحب سرینگر میں خواجہ اکبر شاہ عشاوری رئیسِ زینہ کدل کے ہاں مقیم تھے ۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب بھی کشمیر تشریف لائے ۔ وہ حسبِ معمول خواجہ غلام مصطفیٰ بچھ مرحوم فتح کدلی کی کوٹھی میں ، جو برلبِ دریا ہے ، فروکش ہوئے ۔ فوق صاحب لکھتے ہیں :

''مجھے خبر ہوئی ، میں سلام کو گیا ۔ فرمایا جب تک ہم سری نگر میں مقیم ہیں ، یہیں آ رہو ۔ میں نے کچھ عذر کیا ۔ آپ نے آدمی میرے ساتھ بھیجا اور وہ خواجہ اکبر شاہ کو پیر صاحب کا پیغام دے کر میرا بستر اٹھوا لایا ۔ پیر صاحب کے ہاں ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی ۔ تنہائی میں لکھنے پڑھنے کا سب لطف جاتا رہا ۔ پابندی کی نمازیں ، ان کے ساتھ نفل ، ختم اور نعت خوانی ، پھر مجلس کی باقاعدہ حاضری ۔ میں قیدِ بے زنجیر اور ان تکلفات کا عادی نہ تھا ۔ ایک دن پیر صاحب نے خود ہی فرمایا : کہیے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ؟ میں نے کہا : آپ روشن ضمیر ہیں ۔ جو تکلیف ہے وہ آپ سے چھپی ہوئی نہیں ۔ فرمایا : اچھا نفل ، ختم اور نعت خوانی کی مجالس میں آپ اپنی خوشی سے بیٹھ سکتے ہیں ۔

کشمیر میں پیر صاحب کی مجلس میں جو آتا تھا ، قہوہ یا چائے ضرور پی کے جاتا تھا ۔ ویسے بھی عوام کے علاوہ

بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آتے تھے - میں نے ہندواڑہ کے علاقے میں ، جو سرینگر سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے ، ایک مرد اور ایک عورت کو پیدل آتے دیکھا ، جو سرینگر میں صرف ان کی زیارت کرنے اور تعویذ لینے کے لیے جا رہے تھے - کشمیر کے پیروں اور مولویوں اور واعظوں کو ، جو نذر نیاز لینے کے عادی ہیں ، پیر صاحب کی یہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت دیکھ کر بہت فکر ہوئی کہ اس طرح تو رفتہ رفتہ ہمارے سب مرید جماعت شاہی سلسلے میں داخل ہوتے چلے جائیں گے اور ہم ٹھن ٹھن گوپال رہ جائیں گے - چند پیر صاحبان نے مشورہ کر کے یہ صلاح کی کہ چلو خود پیر صاحب کی ملاقات کو جائیں - چنانچہ روانہ ہوئے اور مشہور کیا کہ پیر صاحب نے ہم کو بلا بھیجا ہے - سرینگر آئے ، پیر صاحب سے ملے اور قہوہ پی کر چلے گئے - واپس جا کر دیہات میں یہ مشہور کیا کہ پیر صاحب نے ہمیں اپنے علاقے کی خلافت عطا کرنے کے لیے بلایا تھا اور اپنی طرف سے لوگوں سے بیعت لینے کے اختیارات دیے ہیں - اور یہ بھی فرمایا ہے کہ دور دراز مقامات سے شہر میں آنے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور ان کے کام میں ہرج ہوتا ہے - لوگ غریب ہیں ، اس لیے گو آپ پہلے ہی بیعت لینے کے مجاز ہیں لیکن ہماری طرف سے بھی آپ کو اجازت ہے - پیر صاحبان کی یہ تجویز کارگر ہوئی اور دیہاتی لوگ ، جو فوج در فوج پیر صاحب کے پاس سرینگر میں دوڑ دوڑ

کر جایا کرتے تھے وہ وہیں بیعت ہونے لگے ۔"[1]

خواجہ حسن نظامی دہلوی کا مدت سے یہ دستور تھا کہ وہ روحانی یادگار کے طور پر ہر سال بعض آدمیوں کو کسی علمی کارگزاری ، انسانی خدمت یا خلوصِ قلب کے صلے میں خطابات دیا کرتے تھے ۔ جنوری ۱۹۱۵ع (۱۳۳۳ھ) کے "طریقت" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال انھوں نے اقبال کو "سرّ الوصال" کا اور فوق صاحب کو "وحدتی" کا لقب عطا کیا ۔ یہ انھی خدمات کے اعتراف میں تھا جو وہ "طریقت" کے ذریعے سے اسلام ، تصوف اور صوفیوں کی کر رہے تھے ۔

چار پانچ سال تک یہ رسالہ بڑی شان سے نکلتا رہا ۔ فوق صاحب خود بھی صوفیاء کی مجلسوں میں بلائے جاتے رہے ۔ آپ نے تصوف کے متعلق کئی مفید کتابیں بھی لکھیں جن میں تذکرۃ الصالحین ، تذکرۂ علمائے لاہور ، حیات گنج بخشؒ ، ناصحِ مشفق ، للہ عارفہ اور وجدانی نشتر وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں ۔ اقبال نے وجدانی نشتر کا نام سوز و گداز تجویز کیا تھا ۔ یہ کتاب صوفیوں کے حلقے میں بہت مقبول ہوئی ۔ اس کے چھ حصے تھے ۔ پہلے کا نام 'تجلی' ، دوسرے کا 'برقِ طور' ، تیسرے کا 'پیامِ وصال' ، چوتھے کا 'تیر و نشتر' ، پانچویں کا 'دردِ دل' اور چھٹے حصے کا 'حال و قال' تھا ۔ اس میں قرآن مجید کی وہ انقلاب انگیز آیتیں اور عربی ، فارسی ، اردو اور پنجابی کے وہ دلگداز ، وجد آفرین ، درد انگیز اور پُر اثر اشعار مع اپنی پوری کیفیتوں کے جمع کیے گئے تھے ، جن کے پڑھنے یا سننے سے صاحبِ دل بزرگوں اور پاک باطن لوگوں پر خاص اثر ہوا یا

۱۔ سرگزشت فوق (قلمی) ، صفحات ۱۲۰ — ۱۲۲ ۔

جو دمِ واپسیں کی طرح مرنے والوں کے آخری کلمات ثابت ہوئے۔
اقبال کو اس کتاب کے دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ چنانچہ آپ
نے فوق صاحب کو لکھا[۱] :

"ڈیر فوق !
السلام علیکم۔ آپ کا کارڈ ابھی ملا ہے۔ بھلا آپ کو
آنے کی کیونکر ممانعت ہو سکتی ہے۔ میں نے اس خیال
سے لکھا تھا کہ آپ مصروف آدمی ہیں اس لیے آنے میں
ہرج ہوگا اور تکلیفِ مزید کہ انارکلی، شیرانوالہ دروازہ
سے دور ہے۔
کتاب جب آئے تو ضرور ہمراہ لائیے بلکہ اس کے آنے میں
دیر ہو تو بلا کتاب تشریف لائیں۔ ۲۱ دسمبر کا کشمیری
نہیں ملا اور نہ ہی آپ کی تازہ کتاب 'وجدانی نشتر' نظر
سے گزری ہے۔ والسلام

آپ کا خادم
لاہور ۲۱ دسمبر ۱۹۱۵ء محمد اقبال"

فوق صاحب نے کتاب بھیجی۔ اقبال نے اسے بہت پسند کیا
اور اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا :

"مولوی محمد الدین فوق ایک صاحبِ ذوق آدمی ہیں۔ ان
کی جدت پسند طبیعت ہمیشہ انوکھی باتوں کی تلاش میں
رہتی ہے۔ حال ہی میں انھوں نے ایک کتاب موسوم بہ
'وجدانی نشتر' لکھی ہے جس میں ایسے عربی، فارسی،
اردو، پنجابی اشعار جمع کر دیے ہیں جو تاریخی اعتبار

۱۔ نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۲۹۵ - انوار اقبال، صفحات ۶۰ - ۶۱ -

سے ایک خاص اثر اور سوز و گداز کا باعث ہوئے ہیں ۔ اس کتاب کی تالیف میں ان کو بہت محنت کرنی پڑی ہوگی ۔ مگر مولوی محمد الدین محنت سے گھبرانے والے نہیں ۔ کتاب نہایت اچھی ہے اور دلچسپ ۔ فوق صاحب کی تلاش قابل داد ہے اور انسانی قلب کی گوناگوں کیفیات پر روشنی ڈالتی ہے ۔''

اس کتاب کے چوتھے باب میں کہیں فوق صاحب نے حضرت میاں میرؒ کے مرید اور شہزادہ داراشکوہ کے مرشد مُلّا شاہ بدخشانی کا یہ واقعہ بھی لکھ دیا تھا کہ ایک دفعہ آپ نے کسی خاص جذبے کے ماتحت یہ شعر کہا :

پنجہ در پنجۂ خدا دارم
من چہ پروائے مصطفٰیؐ دارم

شاہ جہان بادشاہ نے علمائے دہلی سے فتویٰ طلب کیا اور مُلّا شاہ کو بلا کر کہا کہ اس شعر سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی توہین کا پہلو نکلتا ہے ۔ حضرت مُلّا شاہ نے جواب دیا توہین تو وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنے اور مصطفٰیؐ اور خدا میں تفریق کرتے ہیں ۔ خدا کے پنجے میں آپ بھی ہیں ، میں بھی اور مصطفٰیؐ بھی ۔ پھر پروا کس کی اور خوف کس بات کا ۔ اس پر بادشاہ خاموش ہو گیا اور لوگوں نے سمجھا کہ مُلّا شاہ کا جادو چل گیا وغیرہ وغیرہ ۔

چونکہ اس واقعے کا کتاب سے کوئی خاص تعلق نہ تھا ، اس لیے اقبال نے اس کے متعلق فوق صاحب کو علیحدہ خط کے ذریعے توجہ دلاتے ہوئے لکھا[1] :

۱۔ نقوش ، مکاتیب نمبر ، ص ۲۹۵ ۔ انوار اقبال ، صفحات ۶۱ - ۶۲ ۔

''ڈیر فوق!

السلام علیکم - دونوں کتابیں مل گئی ہیں - انگریزی کتاب پہلے سے میرے پاس موجود ہے - افسوس ہے کہ آپ کو مفت میں تکلیف ہوئی -

'وجدانی نشتر' خوب ہے مگر تعجب ہے کہ شیخ 'ملا' کے ملحدانہ و زندیقانہ شعر:

من چہ پروائے مصطفیٰؐ دارم

کو آپ اس کتاب میں جگہ دیتے ہیں - اور 'ملا' کی تشریح کس قدر بے ہودہ ہے - یہی وہ وحدت الوجود ہے جس پر خواجہ حسن نظامی اور اہلِ طریقت کو ناز ہے - اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے اور ہم غریب مسلمانوں کو ان کے فتنوں سے محفوظ رکھے - 'وجدانی نشتر' پر ریویو دوسرے صفحے پر درج ہے -

لاہور ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء — محمد اقبال''

اقبال نے اپنے کلام میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ نائبِ حق ہیں - ان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے، ہر شے ان کے تابع فرمان ہے - یہاں تک کہ ان کے اشارۂ انگشت سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کار کشا کارساز

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ او شق می شود

اسی اثنا میں اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' شائع ہوئی جس میں انھوں نے مسلمانوں کو عرفانِ نفس، تعینِ ذات اور قوتِ عمل

کا احساس دلاتے ہوئے فلسفۂ اشراق ، عجمی تصوف اور صوفیانہ شاعری پر تنقید کی کہ انھی چیزوں کے اثر سے مسلمانوں کی پوری قوم قوتِ عمل سے یکسر محروم ہو گئی ہے - چونکہ یونان میں فلسفۂ اشراق پھیلا اور ایران میں تصوف ، اس لیے حکیم افلاطون یونانی اور حافظ شیرازی کا ذکر بھی آیا اور یہ ذکر کسی حد تک ناگزیر بھی تھا - چنانچہ اقبال نے تصوف کے بعض معتقدات سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں 'بز اور گوسفند قرار دیا - اس پر طبقۂ صوفیاء بھڑک اٹھا اور ہر طرف سے مثنوی کی مخالفت میں مضامین شائع ہونے لگے -[1] اقبال نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے بہت سے مضامین اخبار 'وکیل' امرتسر میں شائع کرائے - ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ع کے شمارے میں اقبال کا جو مضمون ''اسرارِ خودی اور تصوف'' کے عنوان سے نکلا ، اس کا آخری حصہ چونکہ فوق صاحب کے ایک استفسار کے جواب میں تھا ، اس لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے - اقبال لکھتے ہیں :

> میرے دوست منشی محمد دین فوق ایڈیٹر 'اخبار کشمیری' اور 'طریقت' نے مجھ سے سوال کیا کہ تم نے حافظ پر کیوں اعتراض کیا ہے - وہ رسالہ 'طریقت' کے ایڈیٹر ہیں ، اس حیثیت سے ان کو تصوف میں دلچسپی ہے - اس وقت فرصت کم تھی اور چونکہ مضمون طویل تھا ، میں نے ان کو کوئی جواب نہ دیا - عام مسائلِ تصوف پر گفتگو کرتا رہا - بعد میں انھوں نے اپنی تازہ تصنیف 'وجدانی

۱- اس سلسلے میں میرا مضمون ''معرکۂ اسرارِ خودی'' ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو مجلہ 'اقبال' لاہور میں اکتوبر ۱۹۵۳ع اور اپریل ۱۹۵۴ع میں شائع ہو چکا ہے -

نشتر' نام میرے دیکھنے کے لیے ارسال فرمائی تو معلوم ہوا کہ ان کے سوال کا جواب ان کی تصنیف میں موجود ہے - صفحہ ۹۴ پر مصنف لکھتے ہیں :

''اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے ، جو بڑا متشدد بادشاہ تھا ، ایک مرتبہ حکم دیا کہ اتنی مدت کے اندر جتنی طوائفیں ہیں ، سب نکاح کر لیں ، ورنہ کشتی میں بھر کر سب کو دریا برد کر دوں گا - سینکڑوں نکاح ہو گئے مگر پھر بھی ایک بڑی تعداد رہ گئی - چنانچہ ان کے ڈبونے کے لیے کشتیاں تیار ہوئیں اور صرف ایک دن باقی رہ گیا - یہ زمانہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا تھا - ایک حسین نوجوان طوائف روزمرہ آپ کے سلام کو آیا کرتی تھی - آپ ورد و وظائف سے فارغ ہوتے ، وہ طوائف سامنے آ کر دست بستہ کھڑی ہو جاتی - جب آپ نظر اٹھاتے ، وہ سلام کرکے چلی جاتی - آج جو وہ آئی تو بعد سلام عرض رساں ہوئی کہ آج خادمہ کا آخری سلام قبول ہو - آپ نے حقیقت دریافت فرمائی - جب تمام کیفیت بیان کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ شیراز کا یہ شعر :

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تم سب یاد کر لو اور کل جب تمھیں دریا کی طرف لے چلیں تو باآواز بلند اس شعر کو پڑھتی جاؤ - ان سب طوائفوں نے اس شعر کو یاد کر لیا - جب روانہ ہوئیں تو یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے درد انگیز لہجے

میں اس شعر کو پڑھنا شروع کیا - جس نے یہ شعر سنا دل تھام کر رہ گیا - جب بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا - ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی - حکم دیا سب کو چھوڑدو -

منشی محمد الدین فوق کو معلوم ہو کہ جو اُن کے لزدیک حافظ کا حسن ہے ، وہی میرے نقطۂ نظر سے قبح ہے اور وہ یہ کہ مسئلۂ تقدیر کی ایک غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو ، جو آئینِ حقۂ شرعیۂ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زانیات کا خاتمہ کرکے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا ، قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانینِ اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت نہ رہی - اور اگر عالمگیر ، دارا کے معاملے میں بھی 'بادشمناں مدارا' پر عمل کرتا تو ہندوستان میں شریعتِ اسلامیہ کی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی -

مجھے امید ہے کہ اس تحریر سے آپ کے ناظرین کو میرا نقطۂ نظر سمجھنے میں مدد ملے گی اور وہ اسی اعتبار سے اسلامی ادبیات کا مطالعہ کرکے اپنے نتائجٔ خود پیدا کریں گے -"

اقبال کے گہرے دوست ہونے کی وجہ سے اہلِ "طریقت" فوق صاحب سے بھی آہستہ آہستہ بدظن ہو گئے اور انھوں نے رسالے کا مقاطعہ شروع کردیا ، جس سے یہ پرچہ ڈولنے لگا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے -

اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ یہ ہوا کہ انھی دنوں مولوی محمد عظیم گکھڑوی مرحوم، جو پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کے مریدوں میں بڑے خوش بیان واعظ تھے، حضرت شاہ صاحب کے بعض منہ لگے مشیروں سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انھوں نے 'طریقت' میں اصلاحی مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابھی اس کے چند ہی نمبر نکلے تھے کہ چاروں طرف سے اس قسم کے مضامین پر اعتراض ہونے لگے۔ فوق صاحب نے اقبال سے مل کر کہا کہ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ لوگ آپ کی مثنوی 'اسرارِ خودی' پر پہلے ہی لے دے کر رہے تھے کہ آپ نے خواجہ حافظ شیرازی کی تعلیم پر ''الحذر از گوسفنداں الحذر'' کا فقرہ چست کر دیا ہے۔ اب ان اصلاحی مضامین سے صوفیاء کے حلقوں میں ناراضی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اقبال نے فرمایا کہ فضا کی تاریکی سے ڈرنا ٹھیک نہیں۔ مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ آج کل کے پیروں اور صوفیوں کی اصلاح فی الحقیقت ثواب کا کام ہے۔ اگر اس اثناء میں یہ رسالہ بند بھی ہو جائے تو اسے جہادِ اکبر سمجھنا چاہیے۔ آخر یہ رسالہ کسی طرح سنبھل نہ سکا اور جتنی جلدی یہ ترقی کی طرف بڑھا تھا، اتنی ہی جلدی بند ہو گیا۔

اس کے بند ہوتے ہی فوق صاحب نے اسی قسم کا ایک اور رسالہ ''نظام'' جاری کردیا مگر اقبال کو ''طریقت'' کے بند ہونے کا افسوس ہی رہا۔ چنانچہ ایک خط[1] میں آپ نے اس کا اظہار اس طرح کیا:

۱۔ رسالہ نقوش، مکاتیب نمبر، جلد اول، ص ۲۹۷۔

"ڈیر فوق !

السلام علیکم - آپ کا خط معہ ملفوف اخبار مل گیا ، جس کے لیے شکریہ ہے - رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے بعض نمبر پنجاب پبلک لائبریری اور شاید یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہوں - آپ کسی روز خود جا کر دیکھ لیں -

رسالہ 'نظام' کا اجرا مبارک ہو - میرے خیال میں تو آپ 'طریقت' ہی کو فروغ دیتے تو شاید حضورِ نظام تصوف کی اشاعت کا صلہ عطا فرماتے - محمد دین صاحب (صوفی پنڈی بھاؤ الدین) آپ سے بہتر نہیں لیکن وہ آدمی معاملہ فہم اور کار دان ہیں - میں بھی آپ کے لیے انشاء اللہ کچھ لکھوں گا - حکیم محمد دین صاحب کئی روز سے نہیں ملے - خدا کرے اچھے ہوں - آپ سے ملیں تو میری طرف سے استفسارِ حال کیجیے - والسلام

۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ع محمد اقبال"

فروری ۱۹۱۹ع میں رسالہ "نظام" کا پہلا پرچہ شائع ہوا - اس میں "مکافاتِ عمل" کے عنوان سے اقبال کے مندرجہ ذیل شعر درج تھے جو اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں :

ہر عمل کے لیے ہے ردِ عمل
دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسمان لیتا ہے
انتقامِ غزال و اشتر و میش

سرگزشتِ جہاں کا سِرِ خفی
کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش
شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بہ روغنِ خویش

رسالہ ''نظام'' کا مزاج اور انداز تو وہی تھا جو پہلے رسالے کا تھا مگر اس کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ''طریقت'' کو حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے چند ہی ماہ بعد اس کا نظام درہم برہم ہو گیا۔

(بشکریہ اقبال ریویو)

• • •

اقبال اور کشمیر

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

کشمیر اور کشمیریوں سے محبت رکھنے کے باوجود اقبال ۱۹۲۱ء تک کشمیر نہ دیکھ سکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب آپ نے منشی محمد الدین فوق کی کتاب 'رہنمائے کشمیر' مطالعہ کی جس میں کشمیر کے دلچسپ تاریخی و جغرافیائی حالات اور قابلِ دید مقامات کا تذکرہ تھا تو آپ نے اپنے ۸ جون ۱۹۱۷ء کے خط میں منشی صاحب کو لکھا :

"رسالہ رہنمائے کشمیر جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت مفید ہے۔ طرزِ بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ افسوس ہے کہ میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا لیکن اس سال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچ لے جائے۔"

مگر 'راہنمائے کشمیر' نے کشمیر دیکھنے کا جو شوق پیدا کیا تھا وہ اس سال بھی پورا نہ ہوا۔ البتہ ۱۹۲۱ء کی گرمیوں میں اس کے لیے خود بخود اسباب پیدا ہو گئے۔

ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش[۱]

۱- شیخ محمد امین رئیس جموں و سابق رکن اسمبلی کشمیر اور شیخ محمد حنیف ٹھیکیدار شیخ محمد بخش مرحوم کے فرزند ہیں۔ تقسیم ہند و پاکستان سے پہلے اپنے کاروبار کی رونق اور ترقی کے لحاظ سے نہایت امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

نامور تاجر اور رئیس تھے - زمانے کے انقلابات ہر ملک اور ہر قوم بلکہ ہر خاندان پر کسی نہ کسی وقت اور کبھی نہ کبھی اپنا سایہ ڈالتے رہتے ہیں - یہی انقلابات ان کو بھی پیش آئے - پنجاب نیشنل بنک کی شاخ سرینگر نے حساب کتاب اور لین دین کے معاملے میں ان کی ڈگریاں اور قرقیاں کرائیں اور ہزارہا روپے کی جائداد سینکڑوں میں نیلام کرادی - چونکہ نیلام اور قرقیوں وغیرہ میں بہت سی بے ضابطگیاں تھیں اور بنک کا رسوخ بھی بہت کام کر رہا تھا اس لیے شیخ محمد بخش مرحوم کے داماد منشی سراج الدین نے جو اس وقت مہتمم بندوبست کے مثل خواں تھے اور بعد میں اپنی قابلیت کی وجہ سے خود افسر مال کے عہدے سے سبکدوش ہو کر ریونیو ایجنٹ (وکیل) ہو گئے تھے ، ڈاکٹر اقبال کی قانونی قابلیت سے مستفید ہونے کے لیے ان کو اس مقدمے کے سلسلے میں کشمیر بلایا - ڈاکٹر صاحب جون ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ مولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی شیخ طاہر دین مرحوم کے ہمراہ کشمیر گئے اور قریباً دو ہفتے تک سری نگر میں رہے - ہاؤس بوٹ میں ان کا قیام تھا - مقدمہ اے - ڈی حکیم سشن جج کی عدالت میں تھا جو بمبئی کے ایک پارسی تھے - اردو اور کشمیری تو بالکل ہی نہ جانتے تھے ، البتہ کشمیریوں کی بدقسمتی سے حکومت کے محکمۂ سیاسیہ و خارجہ میں ''حکیم'' کی رعایت سے مسلمان سمجھے جاتے تھے - چنانچہ ۱۹۲۴ء میں ریشم خانہ کشمیر کے فسادات کے بعد جب حاجی میر شمس الدین مرحوم اور سید محسن شاہ بی - اے - ایل - ایل - بی ، جنرل سیکریٹری مسلم کشمیری کانفرنس لاہور مسلم حقوق و مطالبات اور جلاوطنانِ کشمیر کی شکایات لے کر ایک وفد کے ہمراہ پولٹیکل سیکریٹری اور وائسرائے ہند سے شملہ میں ملے اور کشمیر کے اعلیٰ عہدہ داروں

میں مسلمانوں کی کمی کا اظہار کیا تو پولٹیکل سیکریٹری نے کہا کہ کشمیر کے جوڈیشل ڈیپارٹمنٹ میں سشن جج اے ۔ ڈی حکیم مسلمان موجود ہے ۔ کیا اس سے انصاف کی توقع نہیں ؟ مگر جب انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کیا گیا تو وہ کچھ خفیف سے ہوئے ۔ وہ حکیم کے لفظ سے اس پارسی کو مسلمان سمجھتے تھے ، حالانکہ اُن کے زمانے میں ہندو سررشتہ دار من مانی کارروائیاں کرتے تھے اور کسی کی کوئی پیش نہ جانے دیتے تھے ، اس لیے چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمے کا فیصلہ حسبِ منشا نہ ہو سکا ، جس کا اقبال کو افسوس رہا ۔ چنانچہ آپ نے ۳ اگست ۱۹۲۱ع کے خط میں منشی سراج الدین کو لکھا :

''مخدومی منشی صاحب ! السلام علیکم ۔ آپ کی علالت کی خبر معلوم کرکے تردد ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے ۔ نقل فیصلہ مرسلہ سیٹھ کریم بخش صاحب مل گئی ہے اور میں نے فیصلہ بغور پڑھا ہے ۔

دفعہ ۲۷ کے متعلق جج صاحب بہادر نے جو کچھ لکھا ہے میری رائے میں غلط ہے ۔ ہائی کورٹ میں اس کی چارہ جوئی ہو سکتی ہے لیکن اگر عدالت ہائی کورٹ اس امر میں ہم سے متفق ہو اور واقعات پر متفق نہ ہو تو ہمیں کوئی فائدہ نہیں ۔ اس واسطے زیادہ ضروری امر واقعات کے متعلق ہے ۔

واقعات کے متعلق یہ عرض ہے کہ جج صاحب نے وہی بات لکھی ہے اور اپنے فیصلے کو اسی بات پر مبنی کیا ہے جس کا احساس ہمیں پہلے ہی سے تھا ۔ یعنی یہ بات کہ واقعات اور بے ضابطیگوں سے ڈگری دار کی بد نیتی

ثابت نہیں ہوتی - میں نے یہ تمام باتیں پہلے ہی عرض کر دی تھیں - سب سے بڑی کمزوری اس مقدمے میں یہی ہے - مجھے امید نہیں کہ ہائی کورٹ ، جہاں تک بے ضابطگیوں اور غلطیوں کا تعلق ہے ، اے - ڈی حکیم صاحب سے مختلف تجویز کرے -

شیخ صاحبان اپنی جگہ سوچ لیں اور تمام زیر باری کا اندازہ کر لیں ، جو اپیل وغیرہ کا نتیجہ ہوگی - اگر معمولی مالیت کا مقدمہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا - مقدمے کی مالیت بھی بڑی ہے اور اخراجات وکلا وغیرہ بھی اسی حیثیت سے ہوں گے - غرض ان تمام امور کو ملحوظ رکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہیے - میں نہیں چاہتا کہ ان کی زیر باری میں اور اضافہ ہو - وجوہات اپیل دو چار روز تک لکھ کر ارسال خدمت کر دوں گا - اگر آپ کی مرضی ہو تو آپ اپیل دائر کر دیں - باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے - مجھے افسوس ہے کہ چند ابتدائی غلیطوں کی وجہ سے اس مقدمے کا فیصلہ آپ کے حق میں نہ ہو سکا - مگر خدا تعالیٰ کی درگاہ سے مایوس نہ ہونا چاہیے - اگر یہ صورت نہیں تو اللہ تعالیٰ سیٹھ صاحبان کے لیے کوئی اور صورت پیدا کردے گا - سیٹھ صاحبان کی خدمت میں السلام علیکم -

مخلص محمد اقبال''

یہاں اقبال کو ایک اور مقدمہ بھی ملا - یہ رحمان راہ کا تھا جو مری نگر کا باشندہ تھا اور قتل کے الزام میں ماخوذ تھا - اقبال کی بحث سے یہ شخص پھانسی سے تو بچ گیا مگر قید ہو گیا - اقبال کو

جب اس مقدمے کے فیصلے کی اطلاع ملی تو آپ نے اپنے ۲۰ اپریل ۱۹۲۲ع کے خط میں منشی سراج الدین سابق افسر مال کشمیر کو لکھا :

"ڈیر منشی صاحب ! السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے - الحمدللہ کہ خیریت ہے - انشاء اللہ آپ کے ارشاد پر غور کیا جائے گا -

افسوس کہ رحمان راہ کامل طور پر نہ بچا ، گو پھانسی سے بچ گیا -

لالہ کنور سین[1] صاحب سے لاہور میں میں نے اس مقدمے کا مفصل ذکر کیا تھا اور تمام بڑی بڑی باتیں ان کو سمجھا دی تھیں اور یہ بھی درخواست کی تھی کہ مقدمے کی سماعت جموں میں کریں تو میں بغیر مزید فیس کے بحث کروں گا ، مگر افسوس ہے کہ وہ مقدمہ کشمیر میں سنا گیا -

بہر حال میں نے منشی اسد اللہ کی تحریر پر اپنی بحث کے مفصل نوٹ ان کو بھیج دیے ہیں جو عدالت میں پیش کر دیے گئے تھے - لالہ کنور سین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری بحث کے مفصل نوٹ مثل پر موجود ہیں - اس وقت اگر میعاد کا سوال نہ اٹھایا جاتا تو مقدمہ

۱- جسٹس کنور سین ایم - اے - (سابق پرنسپل لاء کالج لاہور) جموں و کشمیر میں جج ہائی کورٹ تھے - مولوی سید میر حسن سیالکوٹی کے ممتاز شاگرد ہونے کے علاوہ علمی ذوق سے مالامال تھے اور فارسی عربی سے بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے - آخری عمر میں چیف جج ہو گئے تھے -

مہاراجہ[1] کے سامنے ہی غالباً فیصلہ ہو جاتا ۔ مگر منشی اسد اللہ صاحب یہ خیال کرتے رہے کہ بارِ دیگر مقدمہ کونسل کے سامنے پیش ہوگا جہاں رحمان راہ کی بریت کی توقع ہے ، اس واسطے اس وقت التوا کو غنیمت سمجھا گیا ، ورنہ میں نے تو مہاراجہ صاحب سے بھی کہہ دیا تھا کہ آپ ابھی فیصلہ کر دیں کیونکہ دوبارہ یہاں آنے کا خرچ مؤکل اپنی غریبی کی وجہ سے نہ اٹھا سکیں گے ۔ مگر منشی اسد اللہ صاحب کا یہ خیال تھا کہ التوا بہتر ہے ۔ مگر افسوس کہ بعد میں ان کا خیال پورا نہ ہو سکا اور کونسل اب تک نہ بن سکی ۔ وہ غلطی سے یہ سمجھتے رہے کہ اس فیس میں ، جو انہوں نے مجھ کو دی تھی ، میں دوبارہ کشمیر آؤں گا مگر یہ کیونکر ممکن تھا ؟

اس کے علاوہ مہاراجہ کے سامنے میں نے ان سے یہ کہہ بھی دیا تھا ۔ بہرحال اب میں نے سنا ہے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں لالہ کنور سین صاحب کے فیصلے کے خلاف اپیل کرنا چاہتے ہیں ۔ میں نے مندرجہ بالا طول طویل حالات لکھ کر آپ کو تکلیف دی ہے ۔ اس سے غرض یہ ہے کہ اگر رحمان راہ کے وارثوں کا ارادہ اپیل کرنے کا مصمم ہو تو میں بغیر کسی مزید فیس کے ان کی اپیل لکھ دوں گا ۔ آپ یہ امر ان کے گوش گزار کردیں ۔

چونکہ کشمیر میں یہ معاملہ ہندو مسلمان سوال بن گیا ہے ، اس واسطے ممکن ہے کہ رحمان راہ کے وارثوں کو یہ خیال

---

[1] ۔ اس وقت مہاراجہ پرتاب سنگھ کی حکومت تھی جن کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا ۔

ہو کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا قانونی مشیر بھی تو ایک کشمیری پنڈت ہے - اس کے علاوہ ایک اور دقت بھی ہے اور وہ یہ کہ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے ، مہاراجہ کی طرف سے اگر کسی کو پھانسی کا حکم ہو تو اس کی اپیل گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوتی ہے - قید کا اگر حکم ہو تو اس کی اپیل نہیں ہوتی - بہرحال اگر ان کا ارادہ ہو تو مجھے اس میں کچھ عذر نہ ہوگا - اس صورت میں آپ ان سے کہہ دیں کہ میری بحث کے مفصل نوٹ اور دیگر کاغذات بھیج دیں - باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے - اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا - والسلام[1]

مخلص محمد اقبال ، لاہور"

قانونی کام سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کی سیر کا لطف بھی اٹھایا گیا - چنانچہ ایک دن اقبال ، منشی سراج الدین احمد ، میر منشی ریذیڈنسی کشمیر ، مولوی احمد دین ، سیٹھ کریم بخش ، منشی نور الٰہی تحصیلدار اور چند دیگر علم دوست احباب شکارے (ہلکی کشتی) میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کو گئے - نشاط اور شالا مار باغ میں کافی وقت گزار کر شام کو یہ قافلۂ ادب واپس آیا - یہی وہ وقت تھا جب آفتاب دن بھر میں ساری دنیا کا چکر لگا کر آرام کرنے کے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کرتا ہے - اسی موقع پر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے آفتاب کو مخاطب کر کے کہا تھا :

اے آفتـــاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
شب بھر کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

۱- یہ خط غیر مطبوعہ ہے - اس کی نقل مجھے منشی محمد الدین فوق مرحوم کی یادداشتوں سے ملی ہے -

دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

مولانا آزاد شملہ کی پہاڑیاں دیکھ چکے تھے اور دامانِ کوہسار میں سورج کے غروب و غائب ہونے کا منظر ان کے سامنے تھا۔ لیکن وہ چونکہ کشمیر نہ جا سکے تھے اور ڈل کی اس کیفیت سے بے خبر تھے کہ:

کوہ پانی میں چمن پانی میں بن پانی میں

اس لیے وہ یہ نہ بتا سکے کہ دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر (آفتاب) سفر کے گرد و غبار سے کس طرح اپنے آپ کو پاک صاف کرکے پردۂ شب میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اقبال کے حصے میں آیا۔ صاحبزادہ محمد عمر (سابق منصف جموں و مصنف کتاب ناٹک ساگر) فرماتے ہیں:

"دونوں وقت مل رہے تھے کہ شکارہ (ہلکی کشتی) اس انجمنِ ادب کو لئے ڈل میں پہنچ گیا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شفق پھولی ہوئی تھی اور اس منظر کا عکس ڈل کے شفاف پانی میں شرر افشانی کر رہا تھا۔ اس کیف آور منظر نے عجیب کیفیت پیدا کر رکھی تھی جس نے علامہ ممدوح کے دل پر خاص اثر کیا۔ تھوڑی دیر صحیفۂ قدرت کے اس سنہری ورق کا مطالعہ کرنے کے بعد خلاقِ معانی بحرِ فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو درِ شاہوار نکال لائے۔ نقاشِ فطرت کی قدرت دیکھنا! دو شعروں میں سارے منظر کی تصویر کھینچ دی ہے[1]:

۱۔ رسالہ ہزار داستان، لاہور، اکتوبر ۱۹۲۲ع۔

تماشائے ڈل کن کہ ہنگامِ شام
دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبار سفر
زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب"

جولائی ۱۹۲۱ء کے پہلے عشرے میں اقبال لاہور واپس آ گئے۔ جنتِ ارضی کے اس مختصر سے سفر میں آپ نے کشمیر اور کشمیر کے خستہ حال لوگوں کو جن مصائب و آلام میں مبتلا دیکھا، اس کا اظہار آپ نے اپنی کئی نظموں میں مختلف پیرایوں سے کیا۔ 'پیامِ مشرق' جو اس سفر کے بعد ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس میں اقبال کی تین نظمیں "کشمیر"، "غنی کشمیری" اور "ساقی نامہ" ملتی ہیں جن کے ذریعے حسنِ فطرت اور حقائقِ نمودِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلی نظم میں اقبال نے کشمیر کے سرسبز و شاداب پہاڑوں، مرغزاروں، اس کی گلریز و گل پوش وادیوں اور گل عذاروں کے دلکش حسن کی منظر کشی کرکے اپنی شاعرانہ مصوری اور مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے اور آخر میں "باز بخویشتن نگر" کی چٹکی لے کر اپنے مخاطب سے کہا ہے کہ پہلے ان نعمتوں کو دیکھ، پھر اپنے آپ پر نظر کر کہ تو ان کے لائق بھی ہے؟

اس نظم کے پہلے چار شعروں میں اقبال نے وادیٔ کشمیر کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج برسر نارون نگر

تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز
بستہ بچہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بردمید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر بہ بیں آب شکن شکن نگر

پانچویں شعر میں ناظر کو راگ رنگ کی چیٹک لگائی ہے :

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

آخری شعر میں جو اس ساری نظم کی جان ہے ، حسینۂ کشمیر کا ذکر اس طرح کیا ہے :

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

میر ولی اللہ ایبٹ آبادی اپنی ایک نظم ''نشاط باغ'' میں منظر کشی کا حق ادا کرنے کے بعد یہ کہہ کر رہ گئے تھے کہ :

پھر اس پہ قہر ہو جب گوشۂ چمن سے کوئی
عدوے دین و دل و عقل و ہوش پیدا ہو

مگر اقبال نے ان دو لفظوں میں اس کا سراپا بیان کرنے کے بعد کہ اس کے رخسار گل لالہ کی طرح سرخ اور اس کا جسم چنبیلی کی طرح سفید اور خوشبودار ہے ، اپنے مخاطب کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ :

(۱) پہلے اسے دیکھ ، پھر اپنی حالت پر غور کر کہ تو اسے حاصل کر سکتا ہے ؟

(۲) اس کے حسنِ دلستاں کو دیکھ کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کر کہ کارکنانِ قضا و قدر نے تجھے حورانِ بہشتی کے انتظار کی زحمت سے نجات دے دی ۔

(۳) اس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنے دل سے پوچھ کہ تو جنّتِ کشمیر سے واپس جانا چاہتا ہے ؟

(۴) اس کا جلوہ دیکھ کر اپنی حالت کا جائزہ لے کہ اب تو ہوش میں بھی ہے یا نہیں ؟ دل ترے قابو میں بھی ہے یا نہیں ؟

کیوں چپ ہو نسیم ؟ کچھ تو بولو
آنکھیں تو ملاؤ ، دل کہاں ہے ؟

(۵) ایک مفہوم اور بھی پوشیدہ ہے جو اکبر الہ آبادی کے اس شعر کو پڑھ کر واضح ہو سکتا ہے :

شیخ جی اس بت کا جلوہ دیکھ ساکت ہو گئے
ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چپ ہو گئے[۱]

دوسری نظم میں کشمیر کے مشہور شاعر "ملا" طاہر غنی کے استغنا کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو دروازہ بند رکھتا تھا اور جب گھر سے باہر جاتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا - جب لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا :

ز من آنچہ دیدند یاراں رواست
دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش
متاعے گرانے ست در خانہ اش
چو آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

۱- یہ تصریحات پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی کتاب شرح پیام مشرق صفحات ۳۷۴ - ۳۷۷ سے لی گئی ہیں ۔

یعنی اس گھر کی سب سے قیمتی شے تو میں ہوں ۔ جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو اس کی حفاظت کرتا ہوں اور جب باہر چلا جاتا ہوں تو گھر میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے ۔

ساقی نامہ اقبال نے نشاط باغ کشمیر میں بیٹھ کر لکھا تھا ۔ اس کی تشبیب میں انھوں نے بہار کا منظر پیش کیا ہے ۔ اس کے بعد گریز کی ہے اور ساقی (خدا) سے دعا کی ہے کہ شراب حریت کے چند قطرے ٹپکا کر کشمیریوں کے دلوں کو گرما دے تاکہ اس خاکستر سے چنگاریاں پیدا ہو جائیں ، مردہ جسموں میں سوز کی لہر دوڑ جائے اور ہر بے خود و بے جان ، خودی اور زندگی کی لذت سے آشنا ہو جائے ۔ دیکھیے :

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے
نجوم پرن رست از مرغزارے

بہار کا موسم بھی کس قدر دلفریب ہے ! باغ میں ہر طرف ستارے (خوشۂ پروین) اگ رہے ہیں ۔

زمیں از بہاراں چو بال تدروے
ز فوارہ الماس بار آبشارے

بہار کی وجہ سے زمین تدرو[۱] کے پروں کی طرح خوشنما ہو گئی ہے ۔ آبشاروں کا جو پانی فواروں سے نکل رہا ہے وہ الماس کی طرح سفید ہے ۔ گویا فواروں سے ہیرے ٹپک رہے ہیں ۔

نہ پیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل
نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے

جس طرف نظر اٹھاؤ لالہ اور گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں

۱- تدرو مازندان میں ایک نہایت خوش رنگ پرندہ ہوتا ہے ۔

اور ہر طرف سبزہ لہلہا رہا ہے -

لبِ جو خود آرائیِ غنچہ دیدی ؟
چہ زیبا نگارے ، چہ آئینہ دارے

نہر کے کنارے کلیاں کس قدر حسین معلوم ہوتی ہیں ، گویا ایک حسینہ آئینے میں اپنا منہ دیکھ رہی ہے -

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد
ز آوائے سارے ز بانگِ ہزارے

درختوں کی خلوت سے خوشنوا پرندوں کے گانے کی کیسی سریلی آوازیں آ رہی ہیں - بلاشبہ سار اور ہزار (بلبل) کی آواز سے جسم میں روح اور روح میں وصل کی آرزو پیدا ہو رہی ہے -

نوا ہائے مرغ بلند آشیانے
در آمیخت با نغمۂ جوئبارے

پرندوں کے گانے کی آوازیں اور آبشار اور جوئبار کے نغمے مل کر عجیب دلکشی کا عالم پیدا کر رہے ہیں -

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را
نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را
رہا سازد از محنتِ انتظارے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے کشمیر کے اس بے نظیر خطے میں جنت لا اتاری ہے تاکہ انسان اس کے انتظار کی زحمت سے رہائی حاصل کر سکے ، یعنی جیتے جی جنت کا لطف اٹھا سکے -

چہ خواہم دریں گلستان گر نہ خواہم
شرابے ، کتابے ، ربابے ، نگارے

باغ میں سماں ایسا ہے کہ طبیعت خواہ مخواہ شراب ، کتاب (غزل) رباب (موسیقی) اور نگار (محبوب) کی طرف راغب ہو جاتی ہے -

یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے اور شاعر ساقی (خدا) سے التجا کرتا ہے کہ :

سرت گردم اے ساقیٔ ماہ سیما
بیار از نیاگانِ ما یادگارے

اے ساقیِ ماہ طلعت ، تیرے قربان ! بزرگوں کی یاد دلوں میں از سرِ نو تازہ کردے -

بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را
فروزد چو نورے بسوزد چو نارے

ہمارے ساغر میں ایسی شراب ٹپکا دے جو قلب کو تڑپا دے اور روح کو گرما دے - یعنی ہمارے دلوں میں آزادی کا ایسا جذبہ پیدا کر دے جو ہمیں سرفروشی پر آمادہ کردے -

شقائق بروياں ز خاک نژندم
بہشتے فرو چیں بمشتِ غبارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشاں
ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے

میری سرنگوں اور خوار قوم میں مجاہد نوجوان پیدا کردے تا کہ یہ مشتِ غبار دنیا میں عیش و عشرت سے ہم کنار ہو جائے - تو دیکھتا نہیں کہ کاشغر (ترکستان) سے کاشان (ایران) تک ہر شہر سے ایک ہی آواز بلند ہو رہی ہے -

ز چشمِ امم ریخت آں اشک نابے
کہ تاثیر او گل دماند ز خارے

قوموں کی آنکھ نے اپنی پستی اور ذلّت پر ایسے آنسو بہائے ہیں کہ ان کی تاثیر سے کانٹوں سے پھول اگ آئے ہیں۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے

غلامی نے کشمیریوں کی فطرت ایسی مسخ کردی ہے کہ انھوں نے بت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

پست ہمتی سے ان میں کوئی بلند خیالی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنی خودی سے بیگانہ اور ذلّت و رسوائی کی اس منزل میں ہیں جہاں انسان کو اپنی ہستی سے خود شرم آتی ہے۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تارتارے

ان کی محنت کے صدقے میں آقا ریشمی قبا پہنتے اور شال دوشالے اوڑھتے ہیں لیکن ان کے اپنے مقدر میں تن پر پھٹے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے

نہ ان کی آنکھ میں روشنی ہے، نہ ان کے سینے میں دل، یعنی نہ ان میں عقل ہے نہ عزم۔

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اے خدا! اس شراب یعنی جذبۂ حرّیت سے کشمیری مسلمانوں کو بھی سرشار کردے تاکہ وہ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو سکیں۔

اقبال کو یقین تھا کہ اگر ان کے ہم وطن ان کے پیغام پر عامل ہوئے تو ایک دن اُن کی حالت یقیناً بہتر ہو جائے گی۔ مگر بعض لوگوں نے شکوہ کیا کہ اس نظم میں کشمیریوں کی ہجو کی گئی ہے۔ اقبال نے اس کی تردید کرتے ہوئے اپنے ۲۶ مئی ۳۲ء کے خط میں میر خورشید احمد (فارن آفس دہلی) کو لکھا:

"ساقی نامۂ کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر تعجب ہوا۔ افسوس ہے ہندوستان سے فارسی رخصت ہو گئی۔ سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی کیونکہ ایک زمانے میں کشمیر ایران کا ہمسر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ دکھڑے کی بنا بھی واقعات پر ہے جس کا میں نے کشمیر میں خود مشاہدہ کیا ہے۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہیں، نہ کشامرۂ پنجاب۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے لیے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آبا و اجداد اہلِ خطہ میں سے ہیں۔"

ادبیاتِ کشمیر:

کشمیر کے فارسی لٹریچر کی اقبال کے دل میں بڑی قدر و منزلت

تھی - ملا طاہر غنی کشمیری کی شخصیت سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ ان کے استغنا کا ذکر کرنے کے علاوہ ان کے بعض اشعار پر تضمینیں بھی لکھیں -

کشمیر کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کی بھی اقبال ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرتے تھے - بعض دوستوں کو خود بھی بعض عنوانات پر قلم اٹھانے کے لیے ابھارتے رہتے تھے - چنانچہ ۸ جون ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں منشی محمد الدین فوق مدیر 'اخبار کشمیری' لاہور کو لکھتے ہیں :

''کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے - البتہ کشامرہ کی قبر پرستی ایسا مضمون ہے جس پر، جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ نے اب تک کچھ نہیں لکھا - اس طرف سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے -

رسالہ ''رہنمائے کشمیر'' جو حال میں آپ کے قلم سے نکلا ہے، نہایت مفید اور دلچسپ ہے - طرز بیان بھی دلکش ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ عام لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگا - افسوس ہے میں آج تک کشمیر کی سیر نہیں کر سکا، لیکن امسال ممکن ہے آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچ لے جائے -''

۱۹۲۲ء میں جب کشمیر کے مشہور شاعر غلام احمد مہجور نے تذکرہ شعرائے کشمیر لکھنے کا ارادہ کیا اور اقبال سے اس سلسلے میں مدد اور مشورہ طلب کیا تو آپ نے اپنے ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کے خط میں ان کی حوصلہ افزائی ان الفاظ میں کی :

''مجھے یہ معلوم کرکے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرۂ

شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں - میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے ادھر توجہ نہ کی - آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے - افسوس کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہوگیا - اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی ، نیز مسلمانانِ کشمیر کی غفلت ہے - کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش و حفاظت کے لیے ایک سوسائٹی بنائیں ؟ ہاں "تذکرہ شعرائے کشمیر" لکھتے وقت مولانا شبلی کی "شعر العجم" آپ کے پیشِ نظر ہونی چاہیے - محض حروفِ تہجی کی ترتیب سے شعرا کا حال لکھ دینا کافی نہیں ہوگا - کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں - مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور ہوگی اور اگر کبھی خود کشمیر میں یونی ورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کا کورس ہونا یقینی ہے - میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے -

امید ہے جناب کا مزاج بخیر ہوگا -

میرے پاس کوئی مسالہ تذکرۂ شعرا کے لیے نہیں ہے ، ورنہ آپ کی خدمت میں ارسال کرتا - والسلام"

اسی طرح ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ع کے ایک خط میں منشی محمد الدین فوق کو لکھا :

"شبابِ کشمیر ضرور لکھیے ، بہت مفید کتاب ہوگی - اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں

خودداری کی روح پیدا کی جائے ۔ میں نے بھی ایک نظم اس مضمون پر لکھی ہے جو عنقریب فارسی مجموعہ (پیام مشرق) میں شامل ہوگی ۔ افسوس ہے مجھے تاریخ کشمیر سے بہت کم آگاہی ہے ۔ ممکن ہے پنڈت شیو نرائن شمیم آپ کی مدد کر سکیں ۔ راج ترنگی غالباً ان کے پاس ہے ۔ اگر نہ ہوئی تو پنجاب پبلک لائبریری سے ضرور مل جائے گی ۔"

کشمیر میں جس قدر صوفیائے کرام تبلیغ اسلام کی خاطر آئے ان میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کو سب سے زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی ۔ اقبال ان کی عظمت ، بزرگی ، غیر معمولی شخصیت اور ان کے شاندار کارناموں سے بہت متاثر تھے ۔ انھوں نے "جاوید نامہ" میں ان کا ذکر بڑے پُرخلوص الفاظ میں کیا ہے جس کے حرف حرف سے عقیدت ٹپکتی ہے ۔

حضرت سید علی ہمدانی ولیِ کامل ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ عالمِ دین اور صاحبِ علم تھے ۔ آپ نے کشمیر میں بیٹھ کر وہاں کی ضرورت کے مطابق بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور اس طرح جہالت کے عفریتوں کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا ۔ آپ نے اپنے وعظ و تبلیغ سے اسلام پھیلایا اور لوگوں کو سیدھا راستہ دکھا کر مسلمان کیا ۔ کشمیر کے لوگ آج تک ان کی عزت کرتے اور ان کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں ۔ سرینگر کی خانقاہ معلیٰ جہاں بیٹھ کر آپ عبادتِ الٰہی کیا کرتے تھے ، بڑی متبرک خیال کی جاتی ہے ۔ اقبال کو ان کی تصنیفات دیکھنے کا کس قدر شوق تھا اس کا اندازہ آپ کے ایک خط کی مندرجہ ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے :

"ذخیرۃ الملوک (مصنفہ امیر کبیر سید علی ہمدانی) کے دیکھنے کا بھی مشتاق ہوں ۔ سنا ہے کوئی شخص کشمیر میں اس کا ترجمہ اردو میں کر رہا ہے ۔"[۱]

یہ کتاب سید صاحب نے غالباً کشمیر کے سلاطین کی ہدایت کے لیے لکھی تھی ۔ اس کا ایک عمدہ خطی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے جس کے ۲۵۰ صفحات ہیں اور ہر صفحے میں پندرہ سطریں ۔ ۱۳۲۱ھ میں یہ کتاب مطبع افغانی امرتسر نے شائع کی تھی ۔ اس میں معرفتِ الٰہی ، دینِ حقانی ، معرفتِ بشری ، فرائضِ انسانی ، مکارمِ اخلاق ، حسنِ معاشرت ، لوازمِ حکومت اور جملہ امور ضروری پر بحث کی گئی ہے ۔ اس کا اردو ترجمہ بھی "منہاج السلوک" کے نام سے ۱۳۳۴ھ میں لاہور سے شائع ہوا تھا ۔

سید صاحب کے کمالات کا اعتراف اقبال نے "جاوید نامہ" میں بھی کیا ہے ۔ اقبال کی یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی فارسی کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی ۔ یہ ایک قسم کا خیالی سفر نامہ ہے جس میں شاعر نے مختلف آسمانوں کی سیر کا حال بیان کیا ہے ۔ وہ چاند ستاروں میں پہنچتا ہے جہاں اسے دنیا کی مشہور ہستیاں ملتی ہیں ۔ شاعر ان سے باتیں کرتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں اپنے قیمتی خیالات پیش کرتا چلا جاتا ہے ۔

اس کے بعد شاعر ایک ایسی اونچی جگہ پہنچ جاتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ۔ اس جنت میں اسے کشمیر کے دو بزرگ نظر آتے ہیں جن میں ایک تو سید علی ہمدانی ہیں اور دوسرے مُلا طاہر غنی ۔ سید علی ہمدانی کا تعارف اقبال ان الفاظ میں کراتے ہیں :

۱- یہ خط ۵ مئی ۱۹۲۶ء کو منشی محمد الدین فوق کے نام لکھا گیا ۔

سیّد السّادات ، سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ امم
تا غزالی درسِ اللہ ھو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
مرشدِ آں کشور مینو نظیر
میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں

یعنی وہ سیّدوں کے سردار ، عجمیوں کے سالار اور امّتوں کی تقدیر کے معمار تھے - امام غزالی جیسے بزرگوں نے انھی کے خاندان سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا - انھوں نے کشمیر کے باشندوں کو راہِ حق دکھا کر مسلمان کیا - وہ سردار بھی تھے ، درویش بھی اور بادشاہوں کے مشیر و صلاح کار بھی - انھوں نے کشمیر کو علم ، صنعت ، تہذیب اور دین کی نعمت سے مالامال کیا -

مُلاّ طاہر غنی کشمیر کا ایک مشہور شاعر تھا - وہ بڑا خوددار ، غیرت والا اور بات کا پکا تھا - اس نے ساری عمر کسی بادشاہ کی مدح نہیں کی - اس کا فارسی کلام آج تک لوگوں میں مقبول ہے -

شاعر یعنی اقبال ان دونوں بزرگوں سے ملتا ہے اور کشمیر کے متعلق بات چیت کرتا ہے - باتوں باتوں میں اس دردناک تاریخی سانحے کا ذکر بھی آتا ہے جب کشمیر کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کیے بغیر اس کے بد اندیش انگریز حکم رانوں نے پچھتر لاکھ روپیہ لے کر یہ علاقہ ڈوگروں کے راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا اور اس نے کشمیریوں کو اپنا غلام بنا لیا :

دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزان فروختند

اقبال نے شاہِ ہمدان سے سوال کیا: ''میں آپ سے یہ بھید معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر خدا کی مرضی یہ تھی کہ بندے اس کی اطاعت کریں تو اس نے شیطان کو کیوں پیدا کیا، جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شیطان اس دنیا میں بدی اور برائی ایسی خوبصورت شکل میں پیش کرے گا کہ بندے خود بخود اس کی طرف مائل ہو جائیں گے؟ برائی بڑی دلکش ہوتی ہے اس لیے کمزور انسان کس طرح اس سے بچ کر اچھے کام کر سکتے ہیں؟''

شاہِ ہمدان نے اس کے جواب میں فرمایا: ''اے اقبال! تیرے دل میں یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ تو انسان کی اُن قوتوں سے واقف نہیں جو پوشیدہ ہیں اور نظر نہیں آتیں۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ان قوتوں سے واقف ہو جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں چھپا رکھی ہیں، تو وہ برائی سے بھی اپنے لیے بھلائی پیدا کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا تو کیا ہے اور دیکھنے میں یہ برائی ہے، مگر اس لیے نہیں کہ انسان اس سے دوستی پیدا کرے بلکہ اس لیے کہ وہ اس سے جنگ کرے۔ اگر اس نے ایک طرف شیطان کو پیدا کیا ہے تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو چیز انسان کے حق میں بری ہے وہ شیطان نہیں بلکہ اس سے دوستی ہے۔ اگر انسان اس سے لڑے تو یہی برائی اس کے لیے بھلائی بن سکتی ہے۔

شاید اس مثال سے یہ بات تیری سمجھ میں آ جائے۔ تو انسان کو تلوار سمجھ اور شیطان کو سان کا پتھر۔ انسان جس قدر اس کی مخالفت کرے گا اسی قدر اس کی پوشیدہ قوتیں چمکیں گی۔ کبھی تو

نے اُس شخص کو دیکھا ہے جو تلوار کو سان پر چڑھاتا ہے ۔ اگر وہ تلوار کو سان کا دوست بنادے یعنی تلوار کو سان کی حرکت کے ساتھ حرکت دے تو قیامت تک تلوار میں دھار نہیں آ سکتی ۔ لیکن وہ اس کے خلاف عمل کرتا ہے ۔ تلوار کو سان کی حرکت کے خلاف حرکت دیتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تلوار میں دھار پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس لیے جس طرح تلوار سان سے جنگ کرتی ہے اور اس جنگ ہی کی بدولت کاٹ کرنے والی شمشیر بن جاتی ہے ، اسی طرح انسان شیطان سے جنگ کرکے خدا کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے ۔"

"مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہر وقت شیطان سے جنگ کرتا رہے ۔ پس تو اس کی مخالفت کرکے روز بروز اپنی تلوار کی دھار تیز کرتا چلا جا تاکہ تیری ضرب کاری ہو ۔ اگر تو اس بھید سے بے خبر رہے گا اور مخالفت کی بجائے شیطان سے دوستی پیدا کرلے گا تو دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہو جائے گا ۔"

شاہِ ہمدان کو مہربان پا کر اقبال نے دوسرا سوال کیا :
"اے مرشد ! دنیا کی حالت یہ ہے کہ انسان کو انسان کھائے جاتا ہے ۔ ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے ۔ آج کل کشمیر کے لوگوں کی حالت نہایت خراب ہے ۔ ان کے چاروں طرف مشکلات کے بادل چھائے ہوئے ہیں ۔ ہر شخص مصیبت میں گرفتار ہے ۔ اگرچہ کشمیر کے مسلمان علم ، فن ، عقل ، فہم اور صنعت و حرفت میں کسی سے پیچھے نہیں ، لیکن وہ اپنے آپ سے غافل ہیں اور اپنے ہی وطن میں ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ایک مدت سے کافروں کے غلام ہیں اور اس غلامی کی وجہ سے ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے ۔ حالانکہ یہ قوم ہمیشہ سے ایسی ذلیل نہ تھی ۔ کبھی فوجوں کے

منہ پھیرنے والی اور حکومت چلانے والی تھی ۔ مجھے یہ بتایا جائے کہ اس ذلت کا سبب کیا ہے ؟ کیا وجہ ہے کہ صدیوں سے اس ملک میں کوئی شہاب الدین پیدا نہیں ہوا جس نے بہت سے ملک فتح کیے تھے ؟"

شاہ ہمدان نے جواب دیا : "اے اقبال ! میں تجھے ایک باریک نکتہ سمجھاتا ہوں ۔ پوری توجہ سے سن ۔ اگر مسلمان دنیا میں دوبارہ عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انسان دو چیزوں سے مل کر بنا ہے ۔ ایک روح ، دوسرے بدن ۔ تن سراسر مٹی ہے اور جان ایک قیمتی جوہر ۔ اس لیے جان کی حفاظت کے لیے جسم کو قربان کرنا زندہ رہنے کی پہلی شرط ہے ۔ اگر تو جسم کے کسی حصے کو جسم سے جدا کر دے تو وہ تیرے ہاتھ سے جاتا رہے گا ، یعنی ضائع ہو جائے گا ، لیکن اگر تو اپنی جان کو اپنے سے جدا کر دے تو وہ تجھے پھر حاصل ہو جائے گی ۔

"ہر انسان جسم کا قیدی ہے لیکن جو شخص اپنے آپ سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ جسم کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ اور پھر یہ جان جس کو بچانے کے لیے وہ پناہ ڈھونڈتا ہے اس کی نگاہ میں ہوا سے بھی سستی ہو جاتی ہے اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کفن سر سے باندھ کر میدانِ جنگ میں کود پڑتا ہے اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیتا ہے ۔"

"اے اقبال ! یاد رکھ کہ اگر تو اپنی جان قربان کر دے تو تیری جان ہمیشہ کے لیے تیری ہو جائے گی اور اگر تو موت کے ڈر سے گھر میں چھپ کر بیٹھ رہے گا تو غور سے سن لے کہ تیری جان تیرے پاس تھوڑے عرصے کی مہمان ہے ، آخر ایک دن مرنا ہے" :

اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

"جو لوگ خدا کی راہ میں جان دینے سے جی چراتے ہیں، ان سے پوچھ کہ کیا تم اسی طرح ہمیشہ زندہ رہ سکو گے؟ کیا تم موت کو کسی طرح ٹال سکتے ہو؟ جو شخص جان دیتا ہے وہ دراصل اسے واپس لیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتا ہے۔ اور جو اپنی جان نہیں دیتا وہ اسے ضائع کرتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد اقبال بھرتری ہری، ، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور سلطان ٹیپو شہید سے ایک ایک کر کے ملتا ہے اور اس جوش و خروش کا نظارہ کرتا ہے جو ان کے سینوں کو گرمائے ہوئے تھا۔

یہاں سے شاعر لوٹنے کی ٹھہراتا ہے کہ غیب سے کچھ آوازیں آتی ہیں اور آخر میں نور کی شعاعیں کچھ اس طرح ہر طرف سے ابھرتی ہیں کہ شاعر نور کے سیلاب میں ڈوب کر گم ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ دلچسپ روحانی سفر ختم ہو جاتا ہے۔

تحریکِ کشمیر:

اقبال نے ہندوستان اور اس کے مختلف خطوں کی تعریف میں بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندوستانیوں کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی:

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد
صید را سودائے صیّادی کہ داد
ایں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہ آں فرنگ اندر خروش

اصل شان از خاک دامنگیر ماست
مطلع این اختراں کشمیر ماست

اقبال خود نومسلم کشمیری برہمن تھے - پنڈت موتی لعل اور جواہر لعل بھی کشمیری برہمن ہیں - ان کے ہوتے ہوئے اس دعوے کی صداقت میں کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے ؟

۱۹۳۱ع کی تحریکِ حریتِ کشمیر کے دنوں میں اقبال کشمیر کے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا کرتے اور کشمیری مسلمانوں کے سب سے بڑے ہمدرد تھے - فرماتے تھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ، توقع کے خلاف نہیں - ممکن ہے کبھی اس سے بھی زیادہ انقلاب کشمیر میں آئے -[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا -

ریاستی نظم و نسق کی خرابی او مسلمانوں کی زبوں حالی کے باعث کشمیر میں پہلے ہی سے بے چینی موجود تھی - لیکن ایکاایکی دو ایسے واقعات پیش آ گئے جن سے مسلمان بھڑک اٹھے - ایک واقعہ تو یہ تھا کہ مسلمان ایک جگہ نماز کے لیے جمع تھے اور امام خطبہ پڑھنے والا تھا کہ ایک ہندو سب انسپکٹر پولیس نے امام کو خطبہ پڑھنے سے روک دیا -

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جموں سنٹرل جیل میں ایک ہندو کانسٹیبل نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی - اس پر ایک شخص نے اشتعال انگیز تقریر کی - پولیس نے اسے گرفتار کر لیا - ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ع کو مقدمہ عدالت میں پیش تھا کہ وہاں بھی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوگئے - اس ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلائی جس سے دس بارہ اشخاص شہید ہوگئے - اس کے بعد

۱- تاریخ اقوام کشمیر ، جلد دوم ، ص ۳۳۲ -

کشمیر کے مختلف مقامات پر مسلمانوں نے مظاہرے کیے اور پولیس نے انھیں سختی سے دبا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مظاہروں نے فرقہ وارانہ فسادات کی صورت اختیار کر لی ۔ جب حالات حکومت کشمیر کے قابو سے باہر ہوگئے تو اس نے برطانوی فوج کی مدد طلب کی ۔[1]

اب کشمیر میں تشدد اور سخت گیری کا دور دورہ شروع ہوا اور مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا جانے لگا ۔ ان کی تعلیمی حالت پہلے ہی پست تھی ، افلاس و جہالت نے برا حال کر رکھا تھا ، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند تھے ، مذہبی آزادی نام کو نہ تھی ، پریس اور پلیٹ فارم پر پابندیاں عائد تھیں ، کئی عبادت گاہیں حکومت کے قبضے میں تھیں ، غرض ہر طرح اُن پر عرصۂ حیات تنگ تھا ۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ریاست کے اندر کشمیر مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا جس نے مسلمانوں میں سیاسی شعور اور بیداری کا احساس پیدا کیا لیکن حکومت نے اس پر بھی پابندیاں لگادیں ۔

کشمیریوں کی اس بے بسی اور بے چارگی سے پنجاب کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ چنانچہ ایک طرف تو مجلس احرار نے اہلِ کشمیر پر ان مظالم کے خلاف عملی مظاہرے کیے اور ہزاروں کی تعداد میں جتھے بھیج بھیج کر کشمیر کی جیلیں بھر دیں ، دوسری طرف کشمیر کمیٹی نے اہلِ کشمیر کی ہمدردی میں ایک دستوری اور پُرامن تحریک چلائی اور آئینی ذرائع سے ان کو جائز انسانی حقوق دلانے کی کوشش کی ۔ اقبال کشمیر کمیٹی کے ایک سرگرم

۱- بریف نوٹ آن ایڈمنسٹریشن آف جموں و کشمیر ، بابت ۱۹۳۱ء بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ، ص ۱۲۸ ۔

رکن تھے ، بلکہ جب میرزا بشیر الدین محمود (امیرِ جماعتِ احمدیہ ، قادیان) نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت ترک کردی تو اقبال ہی ان کی جگہ اس کمیٹی کے صدر چنے گئے -

کشمیر کمیٹی نے پہلا کام یہ کیا کہ جو مسلمان کشمیر کی جیلوں میں قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے ، ان کو ہر ممکن قانونی امداد بہم پہنچائی - اس سلسلے میں اقبال نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے بعض نامور وکلاء کو کشمیر روانہ کیا - پٹنہ کے مولوی نعیم الحق محض اقبال سے تعلقِ خاطر کے باعث کشمیریوں کی مدد کو پہنچ گئے - لاہور سے بھی بعض وکیل گئے جنھوں نے مقدمات کی پیروی کی - لیکن حکومت کشمیر نے بعض مسلم وکلاء کو حدودِ ریاست سے خارج کردیا اور بعض کے داخلے پر امتناع عائد کرکے مسلمان سیاسی قیدیوں کو حقوقِ مدافعت اور انصاف سے محروم کر دیا -

اقبال ہی کی مساعی سے حکومتِ کشمیر نے گلانسی کمیشن قائم کیا جس نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ کشمیر میں مکمل مذہبی آزادی ہو ، مذہبی عبادت گاہوں سے سرکاری قبضہ ہٹا کر انھیں عوام کے سپرد کیا جائے ، تعلیم کی اشاعت عام کی جائے ، ابتدائی مدارس زیادہ کھولے جائیں ، مسلم اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے ، ایک خاص عہدہ دار مسلمانوں کی تعلیم کے انتظام کے لیے مقرر کیا جائے ، تمام ملازمتوں کی باقاعدہ تشہیر ہو اور ہر فرقے کے لوگوں کو اس کے تناسب سے حصہ دیا جائے -[1]

ان دنوں اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے بھی صدر تھے - آپ نے کشمیر کے مسئلے کو مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی پیش

۱- خلاصہ رپورٹ گلانسی کمیشن ، ص ۵۱ -

کیا اور اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا :

''جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ، میرے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس ملک میں جو واقعات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں ان کا تاریخی پس منظر بیان کروں۔ ایسے لوگوں کی بظاہر یکایک بیداری ، جن کی خودی کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا ، ان تمام اشخاص کے لیے جنھیں موجودہ ایشیائی عوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق بصیرت حاصل ہے ، ایک مژدۂ جاں فزا ہونا چاہیے ۔ کشمیر کے عوام کے مقاصد بالکل درست ہیں اور مجھے اس معاملے میں کوئی شک نہیں کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کے احساس کا احیاء نہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہوگا بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لیے ذریعۂ قوت بنے گا ۔

''تمام دنیا میں عوام کے اندر جو احساس خود آگاہی پیدا ہو گیا ہے ، وہ اپنے آپ کو تیار کروانا چاہتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس نظم و نسق میں ، جو ان پر حکمرانی کر رہا ہے ، حصہ دیا جائے۔ سیاسی تربیت غیر ترقی یافتہ عوام کے لیے مناسب ہے لیکن جب عوام کا بدلا ہوا نقطۂ نظر نظم و نسق میں انقلاب آفریں اصلاح کا طالب ہو تو نظم و نسق کا مفاد یہ ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جائے۔ کشمیر کے خاص حالات کے باعث دیگر امور کے علاوہ اس ملک کے عوام ایک قسم کی عوامی مجلس مقننہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ ریاست کے والی اور حکومت ہند دونوں عوام کے اس مطالبے پر مناسب غور کریں گے ۔ مجھے اس میں شبہ نہیں

کہ نئے وزیر اعظم[1] اپنی برطانوی نظم و نسق کی ماہرانہ خصوصیات کے ساتھ معاملات کی تہ تک پہنچ جائیں گے اور خوش مزاج لیکن روندے ہوئے عوام ــــ ایسے عوام جنھوں نے قدیم ہندوستان کو بعض بہترین دماغ عطا کیے تھے اور بعد میں مغل ثقافت کو حقیقی دلکشی بخشی تھی ــــ کی کارفرمائی کے لیے کوئی نہ کوئی دائرۂ عمل متعین کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی طرح کشمیر میں بھی دستوری اصلاحات کی راہ میں دشواریاں ہوں، لیکن دیرپا امن اور نظم و ضبط کا تقاضا یہ ہے کہ ان دشواریوں پر جلد از جلد قابو پا لیا جائے۔ اگر موجودہ بحران کے مضمرات کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا اور اس کے اسباب کا ان گوشوں میں پتہ چلانے کی کوشش کی گئی جہاں وہ نہیں پائے جاتے، تو مجھے ڈر ہے کہ حکومت کشمیر اپنے مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا لے گی۔"[2]

گلانسی کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر حکومتِ کشمیر نے ایک اعلامیہ کے ذریعے کشمیر میں مکمل مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور جن جن مساجد پر سرکاری قبضہ تھا ان کو واگزار کیا۔ اذان میں مداخلت کو جرم قرار دیا اور گلانسی کمیشن کی دیگر سفارشات کو رو بہ عمل لانے کا وعدہ کیا۔

اس سلسلے میں حضرت علامہ کے بہت سے بیانات اس وقت کے اخباروں میں نظر آتے ہیں جن میں سے چند ایک کتاب 'حرف اقبال' میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ ۷ جون ۱۹۳۳ء کے ایک بیان میں

۱- کرنل کالون۔

۲- اسپیچز اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال، صفحات ۵۰ — ۵۲۔

مسلمانانِ کشمیر کو مشورہ دیا گیا ہے کہ ''وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کریں ، کیونکہ جب تک کشمیر کو ایک سیاسی خیال پر متفقہ حمایت حاصل نہ ہوگی ، ریاست کے لوگوں کے مفاد کی ترقی کے لیے لیڈروں کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ۔''[۱]

اس کے بعد کچھ ایسا پیچ پڑا کہ کشمیر کمیٹی کے قادیانی ارکان نے میرزا بشیر الدین محمود کے استعفا کے بعد کشمیر کے معاملات میں دلچسپی لینا کم کردی اور کشمیر کمیٹی کا کام سست پڑ گیا ۔ کیونکہ قادیانی کشمیر کمیٹی سے زیادہ اپنے امیر کے وفادار تھے اور امیر کے مشورے اور حکم کے بغیر کوئی کام سرانجام دینا نہ چاہتے تھے ۔ ان حالات میں اقبال نے اس کمیٹی سے استعفا دے دیا اور ۲۰ جون ۳۳ع کو ایک بیان میں فرمایا :

''کشمیر کمیٹی میں میری صدارت محض عارضی تھی ۔ یاد رہے کہ کمیٹی کی تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رونما ہونے پر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوئی تھی اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی ۔ اس لیے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دیے گئے تھے ۔

یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہوگی ، ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کردیا ۔ بہت سے ممبروں نے اس لیے سوچا

۱۔ حرف اقبال ، صفحات ۲۱۹ - ۲۲۰ ۔

کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہیے اور عہدہ داروں کا نیا انتخاب عمل میں آنا چاہیے - کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریقِ کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلافات نے ، جس کے اسباب کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا ، اس خیال کی مزید تائید کی - چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں کمیٹی کے صدر نے اپنا استعفا پیش کیا اور وہ منظور ہو گیا -

''پچھلے ہفتے کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوا - اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسودہ پیش کیا گیا جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو - لیکن کچھ ممبروں نے اس سے اختلاف ظاہر کیا - بعد کے بحث مباحثہ اور گفتگو سے مجھے یہ پتہ چلا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہوگا - چنانچہ میں نے اپنا استعفا پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا -

بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں - میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا - ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے - حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر

کا مرید بن جائے۔ ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔

ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانانِ کشمیر کی راہنمائی اور مدد کے لیے برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیے، اس لیے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجاز ہیں کہ ایک کھلے عام اجلاس میں نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لیں۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔"

کشمیر کمیٹی کی تحلیل کے بعد بھی اس مسئلے سے اقبال کی دلچسپی اور ہمدردی میں فرق نہ آیا۔ چنانچہ ۳۰ جون ۳۳ء کو آپ نے مسلمانانِ ہند سے مخلصانہ اپیل کرتے ہوئے فرمایا:

"گزشتہ چند سال سے مسلمانانِ خطہ جن مصائب و مشکلات میں مبتلا ہیں ان کے تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ وہ مصائب اور مشکلات ہیں جن کا چرچا نہ صرف آپ کے ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں ابتدا ہی سے رہا ہے اور اب تک موجود ہے بلکہ ان کا قومی احساس اکثر مواقع پر افرادِ قوم کے سوتے ہوئے ملّی جذبات کو بیدار کر کے انہیں اخوتِ اسلامیہ کے بھولے ہوئے سبق از سرِ نو یاد دلانے اور ملتِ مرحوم کے فعال عناصر بنانے کا موجب بن چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے اندر تحریکِ خلافت کے بعد تحریکِ کشمیر ہی ایک ایسی

تحریک ہے جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی تشکیل کا موقع ملا اور اس نے قوم کے تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ کی لہر ایک دفعہ پھر دوڑادی ۔

جن قومی جماعتوں نے اہلِ خطہ کے ساتھ ہمدردی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ، آپ کو تسلیم ہوگا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا نام ان کی صف اول میں ہے ۔ مقصد ایک ہو تو مختلف جماعتوں اور اداروں کے عملی طریق ہائے کار کے اختلافات بجائے ضرر رساں ہونے کے بسا اوقات بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں اور حصولِ مقصد کی سچی دھن میں انہیں جس قدر نظر انداز کیا جائے اسی قدر بہتر ہے ۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی نے اپنے مخصوص طریق کار کے مطابق نہ صرف اہلِ خطہ کے حالات و جذبات کی ایسی ترجمانی کی ہے کہ خود اہلِ خطہ بحالاتِ موجودہ ویسی نہ کر سکتے ، بلکہ کمیٹی نے کئی قسم کی گتھیوں کو سلجھانے ، مصیبت زدوں کو مالی امداد بہم پہنچانے اور فسادات کے مقدمات کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی پیروی کرنے میں نہایتِ قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور اب تک دے رہی ہے ۔

ابتدائے کار سے کمیٹی نے حکومت ہند ، برطانیہ اور برطانوی قوم پر اس حقیقت کو ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ کشمیر کا مسئلہ تمام مسلمانانِ ہندوستان کی سیاسی حیات و موت کا مسئلہ ہے ۔ اہلِ کشمیر سے ناروا سلوک ، ان کی جائز اور دیرینہ شکایات سے بے اعتنائی اور ان کے سیاسی حقوق کا تسلیم نہ کرنا ، مسلمانانِ ہند

کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ حق بات بھی یہی ہے۔ اہلِ خطہ ملتِ اسلامیہ کا جزو لاینفک ہیں کہ ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے تو دو نکتوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اول یہ کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کو مستثنٰی کرتے ہوئے حدود ہندوستان کے اندر جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ حصہ ہے جو مذہب اور کلچر کی حیثیت سے خالصتاً اسلامی ہے۔ اور ایسا اسلامی کہ اسلام نے وہاں خدا نخواستہ جبر و اکراہ سے گھر پیدا نہیں کیا بلکہ یہ بارور پودا حضرت شاہ ہمدان جیسے نیک و کامل بزرگانِ دین کے پاک ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے اور انھی کی مساعی تبلیغ دین کا نتیجہ ہے جنھوں نے گھر بار اور وطن محض اس لیے ترک کیے کہ رسول اللہؐ کے لائے ہوئے پیغام سے ان دیار و ممالک کے بسنے والوں کو بہرہ ور کریں اور الحمدللہ کہ وہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے۔ دوسری بات جسے مسلمانانِ ہند کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے، یہ ہے کہ ان کی تمام قوم میں سب سے بڑھ کر اگر صناعی و ہنرمندی اور تجارت کو بخوبی پھیلانے کے جوہر نمایاں طور پر کسی طبقے میں موجود ہیں تو وہ یہی اہلِ خطہ کا گروہ ہے۔ افسوس ہے کہ اہلِ کشمیر کی زبوں حالی انھیں اپنی قوم کا مفید عنصر بننے کے راستے میں مانع آ رہی ہے، بلکہ اقوام عالم کی اس نوع کی ترقی ان کی خدمات سے محروم ہے۔ ورنہ اگر ان کی زندگی بھی

زندہ قوموں کی زندگی ہو تو ان کی صناعی و ہنرمندی کے طبعی جوہر ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بدل دینے میں ممد ثابت ہوں ۔

بہرحال اہلِ خطہ 'قومیتِ اسلامیہ' ہند' کے جسم کا بہترین حصہ ہیں اور اگر وہ حصہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ باقی افرادِ ملت فراغت کی نیند سوئیں ۔ "آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی جن مساعی کا ذکر ہوا ، ان میں ہر ایک اہم ہے اور ہر ایک کی تکمیل ابھی بیسیوں عملی تدابیر کی محتاج ہے ۔ لیکن تمام بھائیوں پر واضح رہنا چاہیے کہ فسادات کے ماخوذین کی کہانی بے حد دردناک ہے ۔ ان کے مقدمے ابھی تک چلے جا رہے ہیں اور ان کی مصیبتوں کا سلسلہ ایک حد تک لامتناہی ہو رہا ہے ۔ ہرچند ریاست کو اس امر پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ مقدمات واپس لے کر ان مصیبت زدوں کو آلام سے نجات حاصل ہونے دے لیکن ظاہر ہے کہ یہ قصے کچھ طولانی سے ہیں ۔ ریاست کے اندر پھر سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے ۔ نہ معلوم یہ ہیجان اب کون سی راہ اختیار کرتا ہے ۔ یہ ایک نیا مرحلہ آ گیا ہے اور اس کے لیے نئی قربانیوں کی ضرورت ہوگی ۔ جو لوگ گزشتہ انقلاب سے ماخوذ ہیں اور ان پر مقدمات چل رہے ہیں ، ان کی طرف بھی توجہ میں ہرگز کوئی کمی نہیں آنی چاہیے ۔ اب تک ان مقدمات کی پیروی خوش اسلوبی سے ہوئی ہے ، لیکن قوم کو اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے کہ کشمیر کمیٹی کے پاس جو روپیہ فراہم شدہ تھا وہ خرچ ہو چکا

ہے اور جب تک قوم روپے سے اعانت پر کمر بستہ نہ ہوگی ، نہ تو نئی پیدا شدہ صورتِ حالات میں کوئی اہم کام سرانجام پا سکے گا اور نہ ان سینکڑوں ماخوذین کو قانونی امداد بہم پہنچانے کا کوئی ذریعہ ہوگا ۔ اس لیے تمام گزشتہ حالات اور موجودہ حالات کے آئندہ امکانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم ملتِ اسلامیہٗ ہند سے نہایت مخلصانہ ُپر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ حالات کی نزاکت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اپنی پہلی قربانیوں میں مزید اضافے کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور جو اعانت وہ پہلے کر چکے ہیں اس کا عملی نتیجہ بھی اسی وقت نیک ثابت ہوگا جب ان موجودہ مراحل پر پھر وہ اسلامی ایثار کا ثبوت دیں ۔ یہ افراد کی امداد نہیں بلکہ اُمتِ رسول کی امداد ہے ۔ اس اپیل کا اختتام حضور پر نور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس حدیث پر کرتا ہوں : ان اللہ متخلص ھذالدین نفساً و لایصلح لدینکم الا السخا و حسن الخلق ، الا فزینو دینکم بھما (خدا نے دین اسلام کو اپنے لیے مخصوص کیا ہے اور دین کی درستی سخاوت اور حسنِ اخلاق سے ہے ۔ مسلمانو ! اپنے دین کو ان ہر دو اوصاف سے آراستہ کرو) ۔"

کشمیر اور اہلِ کشمیر سے علامہ اقبال کی محبت آخر دم تک قائم رہی ۔ ۱۹۳۷ع کی گرمیوں میں وہ صحت کی بحالی کے لیے دوبارہ کشمیر جانا چاہتے تھے مگر اس کا موقع نہ ملا ۔ ۱۶ مئی ۱۹۷۰ع کو بزمِ فکر و دانش مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے زیرِ اہتمام ایک تقریب میں ، جو جسٹس ایس ۔ اے رحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوئی ، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے "اقبال اور وقت کے تقاضے"

کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ ''علامہ اقبال ۱۹۳۷ء کی گرمیاں مجھے ساتھ لے کر کشمیر میں گزارنا چاہتے تھے لیکن کشمیر میں ان کے داخلے پر پابندی تھی - انھوں اجازت کے لیے حکومت سے خط و کتابت کی - یہ اجازت انھیں ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۷ء میں حاصل ہوئی جبکہ کشمیر جانے کا موسم گزر چکا تھا اور آئندہ گرمیوں سے قبل اپریل ۱۹۳۸ء میں وہ وفات پا گئے -''

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اسے قدرت کی ستم‌ظریفی قرار دیا کہ کشمیری قوم کا فرد ہوتے ہوئے علامہ اقبال زندگی بھر دنیائے اسلام کو عشق ، فقر اور حریّت کا سبق دیتے رہے لیکن ان کا وطن کشمیر اور کشمیری قوم ابھی تک غلامی کی کیفیت میں ہے -

اقبال کے دل میں کشمیر کی اتنی محبت کیوں تھی ؟

اقبال نے اپنے اُردو اور فارسی کلام میں جہاں کہیں کشمیر کا ذکر کیا ہے ، محبت اور دل سوزی سے کیا ہے - ''پیامِ مشرق'' کی چند نظمیں پیش کی جا چکی ہیں - ''جاوید نامہ'' کے کئی اشعار بھی دیدنی و شنیدنی ہیں - آپ کی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' میں 'مُلّا زادہ ضیغم لولابی کا بیاض' ایک خاص عنوان ہے جس کے ماتحت کشمیریوں کی حالتِ زار بیان کرکے ان کو خودی و خود شناسی کی تعلیم دی گئی ہے -

اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک ایسا عظیم المرتبت اور عالمگیر شہرت رکھنے والا شاعر اور فلسفی جس کی تعلیم وطنیت اور ذات پات کی تقسیم سے بالاتر تھی ، ایک محدود خطے کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستانیں سن کر تڑپ اٹھتا اور کہتا تھا :

توڑ اس دستِ جفا کیش کو یا رب جس نے
روحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

نصیبِ خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہو کلیمانہ

پھر ان کو عمل کے لیے اس طرح ابھارتا تھا :

نکل کر خانقاہی سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
شیاطین ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری
چہ بے پروا گزشتند از نوائے صبح گاہِ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

اور پھر یہ کہ :

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر
دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

یہ بات تو یقیناً ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اقبال کے ذہن کا حقیقی اور پختہ رنگ وہی تھا جو آخری زمانے میں نظر آتا ہے ، یعنی وہ جغرافیائی حدود اور قومی و نسلی بتوں کو توڑ کر ایک عالمگیر انسانی برادری قائم کرنا چاہتے تھے - اس سے پہلے وہ جو کچھ کہتے تھے اس کی حیثیت محض تجربے کی سی تھی - ان تجربات و نظریات میں بعض تو ایسے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے بلند معیار کے مطابق پایا اور آخر تک نبھایا اور اکثر ایسے ہیں جنھیں پست یا وقتی سمجھ کر چھوڑ دیا - لیکن کشمیر اور اہلِ کشمیر سے محبت و ہمدردی کا معاملہ کسی پہلو سے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھا - وہ خود کشمیری الاصل تھے ، کشمیر ان کے آبا و اجداد کا وطن تھا - کشمیر کی محبت وطن کے لحاظ سے بھی اور وہاں کے باشندوں کی تباہی و پامالی کے لحاظ سے بھی ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی :

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے

اسی بنا پر ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے اور ان کے حقوق و مطالبات منوانے کے لیے اپنے معجزنما کلام کا کچھ حصہ وقف رکھتے تھے - بلکہ بعض اوقات یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتے کہ ظالموں سے باز پرس کرنے والی ہستی فوراً اپنی گرفت مضبوط کیوں نہیں کرتی اور بداعمالیوں کی سزا دینے والے دن (قیامت) کے لمحے نزدیک کیوں نہیں آ جاتے ؟ وہ حیران ہو کر کہتے تھے :

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ دردناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر

کہہ رہا ہے داستاں بے دردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دھقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر !

دراصل وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے - پھر اقبال جیسا بلند رتبہ انسان جس کے دل میں عالمگیر تڑپ تھی ، اس جذبے سے کیونکر خالی رہ سکتا تھا - ان کے کلام میں متعدد جگہ ہندوستان کا ذکر بانداز دلسوزی و محبت آیا ہے - ہندوستان کا ہمالہ ، اس کی گنگا ، اس کی سرسبزی و شادابی ، اس کی حسین فضا ، اس کے آسمان اور اس کی زمین سے انھیں الفت ہے - ایک مقام پر تو وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں :

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

وہ اپنے آبائی وطن کشمیر ، وطنِ ثانی سیالکوٹ اور وطنِ اقامت لاہور سے بھی والہانہ محبت رکھتے تھے - ہندوستان کی غلامانہ پامالی پر ان کے دردناک نالے ہر گوشِ شنوا نے سنے ہوں گے :

رلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ایک درد آشنا انسان جو ساری دنیا کو آزاد دیکھنے کا متمنی

ہو ، جو غلامی کو عذابِ زندگی خیال کرتا اور کسی قوم کے لیے بھی اسے پسند نہ کرتا ہو ، جو مزدوروں کا غم خوار نقیب ، آقائی و سرمایہ داری کا کھلم کھلا مخالف ، غلام قوموں کو آزادی حاصل کرنے پر ابھارنے والا ہو ، اس کے متعلق یہ خیال کرنا ہی بے انصافی ہے کہ وہ اپنے ملک و وطن سے محبت نہیں کرتا تھا جسے صدیوں کی غلامی نے پامال اور سرمایہ داری نے بدحال کر رکھا تھا ۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ مروجہ سیاسی وطن پرستی کا سخت دشمن تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ دنیا میں تمام خوں ریزیاں وطنی حدود اور رنگ و نسل کے امتیازات کی بنا پر ہو رہی ہیں ۔ ہر قوم اپنے سوا دوسری تمام اقوام کو زیر اور اپنا غلام بنانے کی جد و جہد میں مبتلا ہے ، ہر حکومت اپنے ملکی حدود کی توسیع کے لیے کفن بردوش نظر آتی ہے ۔ نظامِ سرمایہ داری آمریت اور جمہوریت کے لباس میں کمزور قوموں اور بے بس مزدور جماعتوں کو کچل رہا ہے اور اس درندگی اور لوٹ کھسوٹ کا نام حبِ الوطنی پڑ گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی وطنیت و قومیت کے سائے میں مذہب ، اخلاق ، شرافت اور نیکی کی کوئی قدر بھی سلامت نہیں رہ سکتی ۔ اقبال ایسی ملعون وطن پرستی کا مخالف تھا ۔ وہ دراصل وطن کا نہیں بلکہ وطنیت کا دشمن تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ وطن ایک مرکز اتحاد ہے اُن تمام لوگوں کے لیے جو اس میں رہتے بستے ہیں ۔ یہ وطنیت اسلام سے ٹکراتی ہے لیکن وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ۔ اقبال نے خود اس نکتے کی تشریح کی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

"اگر قومیت (وطنی قومیت) کے معنے حبِ الوطنی اور ناموسِ وطن کے لیے جان قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے ۔ اس قومیت

کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔"[1]

اقبال سچ کہتے تھے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ:

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم "اقبال کی سیاست کے تین پہلو تھے۔ ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین اور مصلحین کی طرح تمام نوعِ انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہِ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ محض مخصوص

۱۔ مضامین اقبال، ص ۱۲۶۔

گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے ۔ اعلیٰ درجے کا شاعر ، حکیم یا نبی مخصوص گروہوں کو اپنی نظرگاہ نہیں بناتا ۔ اقبال کے متعلق بھی صورتِ حال اسی قسم کی ہے ۔ اس نے شروع میں حب الوطنی کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پُرجوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا ۔ لیکن اس دور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہو گئی اور وہ اس نقطۂ نظر پر آ گیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم میں تغیّر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس قوم کے نفوس میں تغیّر نہ ہو ۔ لہٰذا وہ اہلِ وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جن میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جد و جہد سے سب کے لیے کھل جائے ۔ وطن کی صحیح محبت اس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا ۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اسی امر کے ساتھ وابستہ تھا کہ وہ صرف ہندی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا ۔ اس نقطۂ نظر میں وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ تھا اور تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا ۔ جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے ہر سلیم القلب ہندی مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بیک وقت موجود رہیں گے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے ؟ اقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پُرجوش مجاہد تھا لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بت سمجھتا تھا ۔ جہاں دوسرے قسم کے اصنام کو توڑنے کا کام اس نے اپنے ذمے لیا وہاں یہ بڑا بت بھی

اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا ۔"[1]

مختصر یہ ہے کہ حب الوطنی اور مروجہ وطن پرستی میں فرق ہے ۔ اقبال کسی وطن دوست سے کم محبِ وطن نہیں البتہ وہ وطن پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے ۔ وہ خدا کے بعد بے امتیاز رنگ و نسل تمام خلق خدا سے محبت رکھتے تھے اور جغرافیائی حدود کو توڑ کر سارے عالم انسانیت کو محبت و اخوت کے رشتۂ استوار میں منسلک دیکھنے کے متمنی تھے :

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اسی جذبے کے ماتحت ان کا دل ہندوستان اور کشمیر کی تباہی پر کڑھتا تھا اور وہ اپنے خیالات کے اظہار پر مجبور ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی وہ رزمِ سیاست کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر قوم کی رہبری و راہنمائی کے لیے میدانِ کارزار میں بھی کود پڑتے تھے ۔
(مجلہ اقبال لاہور ، اکتوبر ۱۹۵۶ع)

• • •

۱۔ اقتباس از مضمون "اقبال کی زندگی" مندرجہ "آثار اقبال" ، صفحات ۲۹ — ۴۳ ۔

عید پر شعر لکھنے کی فرمائش

کے جواب میں

مجھے قسم ہے نظامی! مدینے والے کی
ہمیشہ ماتمِ ملّت میں اشک بار ہوں میں
سرودِ مرغِ نواریز و ہم نشینیِ گل
مرے نصیب کہاں غنچۂ مزار ہوں میں

علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم ''بانگِ درا'' کے صفحہ ۲۱۳ پر موجود ہے جس کا عنوان ہے :

''عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں''

یہ چھوٹی سی نظم دراصل مسلمانوں کے زوال کا ایک پُر درد مرثیہ ہے جو لاہور کے مشہور تاریخی باغ شالامار کے ایک ''برگِ زرد'' کی زبانی بیان کیا گیا ہے ، جسے حضرت علامہ نے ''موسمِ گل کا رازدار'' کہا ہے ۔ اس نظم میں ہمارے شان دار ماضی کے تذکرے کے ساتھ ساتھ گزشتہ تہذیب و تمدن کی وہ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں جو اب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکی ہیں ۔ ایک ایک لفظ میں جہانِ معنی پنہاں ہے ۔ مندرجہ ذیل مصرعوں پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں :

گیا وہ ''موسمِ گل'' جس کا رازدار ہوں میں

اجاڑ ہو گئے ''عہدِ کہن'' کے میخانے

خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یادِ فصلِ بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں

ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے !

اقبال نے یہ نظم کب اور کس کی فرمائش پر لکھی ؟ یہ شاید

بہت کم لوگوں کو معلوم ہو ۔ اس بنا پر اس معمے کا حل دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ـــ دلچسپ اس لیے بھی کہ اقبال فرمائشوں پر بہت ہی کم توجہ دیتے تھے ۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہوگا جو اقبال کو گرمِ سوز و ساز کر سکتا تھا اور جس کی تحریک پر اقبال نے یہ دل دوز نظم لکھی ۔

کراچی کے انگریزی روزنامہ ''ڈان'' نے ۱۹۵۰ء میں اس اخبار کا اُردو ایڈیشن شائع کرنے کا ایک ناکام تجربہ کیا تھا ، جس کی ادارت الطاف حسین ، سید حسن ریاض اور فضل احمد صدیقی کے سپرد تھی ۔ اس کی ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں بدر الحسن صاحب اختر بدایونی کا ایک مضمون[1] طبع ہوا جس کا عنوان تھا :

''ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے''

اس میں مضمون نگار نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ علامہ اقبال نے یہ مختصر سی نظم بدایوں کے مولوی نظام الدین حسین نظامی مرحوم مدیر ہفتہ وار ''ذوالقرنین'' ، کی فرمائش پر لکھی تھی ، اپنی تاریخ دانی کا ثبوت یوں دیا :

''یہ اسی سر زمین کے ایک ادیب اور صحافی کی فرمائش کی تکمیل ہے جس کے لیے علامہ نے ایک جگہ کہا ہے :

اے خاکِ بدایونے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ، ہنگامہٴ چنگیزے''

بدایوں کی اہمیت جتانے کے جوش میں انھوں نے تحریف و تصرّف سے کام لے کر علامہ کے مصرعِ اولیٰ کے الفاظ ہی بدل ڈالے اور آشوبِ ہلاکو اور فتنہٴ چنگیز بھی سمرقند کے بجائے

۱۔ ''ڈان اُردو'' ، کراچی ، ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء ، ص ۲ ۔

بدایوں ہی سے اٹھا دیے حالانکہ یہ بالکل انمل بے جوڑ سی بات ہے۔

کون نہیں جانتا کہ بدایوں ہمیشہ ہی تہذیب و تمدن، علم و عرفان اور شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہی وہ مردم خیز خطہ ہے جس کی خاک نے خواجہ نظام الدین جیسے اولیاء اللہ، مولانا ضیاء الدین نخشبی جیسے شاعر اور عہدِ اکبری کے ملاّ عبدالقادر جیسے مورخ پیدا کیے۔ قحط الرجال کے اس دور میں بھی جیّد عالم اور نغز گو شاعر پیدا کرنے میں یہ کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

حضرت علامہ کا محولہ بالا شعر دراصل یوں ہے:

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے، ہنگامۂ چنگیزے

اور یہ "پیامِ مشرق" کے حصہ "مئے باقی" کی ایک غزل میں دیکھا جا سکتا ہے۔[1]

بہرحال اس سے ایک خیر کا پہلو بھی نکل ہی آیا اور مجھے یہ فائدہ پہنچا کہ میرے لیے مزید تحقیق کا راستہ ہموار ہو گیا۔ میں نے مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی مرحوم کے پوتے جمال الدین مونس سے اس کی تصدیق چاہی۔ انھوں نے از راہِ کرم "ذوالقرنین" کے اس پرچے کی نقل مجھے بھجوا دی، جس میں اس نظم کے شانِ نزول کی پوری کیفیت دی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی نے اگست ۱۹۱۵ء میں عید الفطر کی تقریبِ سعید پر بدایوں میں اپنی شان اور نوعیت کا ایک انوکھا مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ ایک قسم کا عید ملن جشن تھا جس میں روحانی غذا کے ساتھ کام و دہن کی

۱۔ "کلیاتِ اقبال" (فارسی)، ص ۲۳۱۔

ضیافت کا اہتمام بھی کیا گیا تھا - مشاعرے کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی :

"اے دلِ پُر داغ بیتابی سے کچھ حاصل نہیں"

مقامی شاعروں کے علاوہ باہر سے بھی چند بزرگ شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا ، جن میں لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - دوسروں کا تو علم نہیں لیکن ان دونوں عظیم شاعروں نے اپنی بعض مجبوریوں کا عذر کر کے مشاعرے میں شرکت تو نہ کی لیکن اپنی نظمیں بھیج دیں ، جو خاص عید کے موضوع پر مولوی نظامی کی "فرمائش کے جواب میں" تھیں - یہ دونوں نظمیں ۱۴ - اگست کے مشاعرے میں پڑھوانے کے بعد پوری روداد کے ساتھ ۲۱ - اگست ۱۹۱۵ع کے "ذوالقرنین" میں شائع کی گئیں - اس بات کو آج تقریباً سرسٹھ برس ہوتے ہیں - اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی حیثیت ایک قیمتی دستاویز کی ہو گئی ہے - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر اس روداد کو ذیل میں من و عن نقل کر دیا جائے تاکہ "عہدِ کہن" کی یاد تازہ ہو جائے اور اس وقت کی سرگرمیوں کا نقشہ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ جائے -

"ذوالقرنین" ، بدایوں ، ۱۴ اگست ۱۹۱۵ع :

"نیا جلسہ ہے --- نظر نہ لگے

آمین ! عید کو ایسا احباب کا جلسہ ! سبحان اللہ ! بانیوں پر اللہ کی رحمت ہو ! ثم آمین ! ہر بات کی وجہ ہوتی ہے - یہ جلسہ بھی ایک بات ہے - قاعدے سے مستثنٰی کیوں ہو ؟ اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی - وجہ ضرور معقول ہوگی - مہتمم دانا ہیں - کچھ سوچ لیا

ہوگا، کچھ دیکھ لیا ہوگا۔ کیا سوچا ہوگا؟ ذرا سوچو تو۔ کیا دیکھ لیا ہوگا؟ ذرا دیکھو تو۔ کیا تفریح مقصود ہے؟ نہیں، اگر یہی مقصود ہے تو مقصد میں پستی ہے۔ کیا کچھ کھلانا پلانا ہی مدعا ہے؟ نہیں۔ اگر یہی مدعا ہے تو مدعا میں رفعت نہیں۔ اصل مقصد و مدعا میں ضرور کوئی ایسی بلندی ہے جو سطحی نگاہ سے نظر نہیں آتی۔ جب جلسے کی دھوم مچی، میں نے غور کی۔ بات کی تہہ کو آخر پہنچا۔ ارادہ ہے کہ اس راز کو کھولوں۔ ملاحظہ ہو۔

اسلام بڑا زبردست مذہب ہے۔ "سب مسلم بھائی ہیں"۔ یہ پہلا سبق ہے۔ ان چار الفاظ نے عناصر کی طرح سب ترقیوں کا احاطہ کر لیا۔ اگر مسلم بھائی نہیں، تو پھر کچھ نہیں۔ کچھ نہیں کی شرح آپ خود کرتے رہیں۔ عید کو کیا خیال فرمایا ہے؟ ایک بستی کے کل مسلمانوں کا ایک جگہ جمع کرنا اور مسلم بھائیوں کا ایک دوسرے کے سامنے آ جانا انتہائے مقصد ہے۔ کیا آج صبح ایسا ہوا؟ آپ سب عیدگاہ میں تو ضرور جمع ہوئے ہوں گے۔ شارع علیہ السلام کی سنّت تو ایسی ہے۔ جواب میں اگر سکوت ہے تو عیدگاہ کو چھوڑیے۔ آپ سب جامع مسجد میں تو ضرور ہی جمع ہوئے ہوں گے؟ اگر اس کے جواب میں بھی فی صد ۸۰ خاموشی ہے، تو آپ نے اپنے محلے کی مسجد کو عیدگاہ کے صحیح عدد کی کسر بنایا ہوگا۔ "ہاں"! ہاں! اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ آفرین، آفرین کی داد اس دعا گو کی طرف سے قبول فرمائیں۔

اب جلسے کے بانیوں اور مہتمموں کی ذکاوت کی داد دیے بغیر کون رہے گا۔ ایک جھلملاتا ہوا کارڈ چھپا۔ تفکہ اور تفنن کے لبھانے والے الفاظ سونے پر سہاگا۔ طبع آزمائی سے شعرا کو جدا تحریک۔ میجک لین ٹرن کا اس پر اضافہ۔ ویسے ان بانیوں اور

متحویوں کی کون سنتا - اب لیجیے سب آ گئے اور انھیں کہنا یہ ہے کہ اسلام کے رسے کے ریشے کیوں کیے ڈالتے ہو - عید کی نماز کو منتشر کرکے جب اپنے قابلِ تعریف اتفاق کا یوں ثبوت دیتے ہو تو تم سے کیا ہوتا ہے - کبھی سوچتے ہو کہ کیا کر رہے ہو - بس اور کچھ نہیں - فقط -

غرض جلسہ منعقد ہوا اور کامیاب جلسہ ہوا -

دارالاخبار کے مکان کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ رنگ رنگ کی آرائش سے دلھن بنا دیا گیا تھا - قریب قریب شہر کے ہر معزز خاندان اور طبقے کے قائم مقام شریک تھے - سارا مکان جلسۂ حاضرین کی زرق برق پوشاکوں سے چمک اٹھا تھا - کمروں اور برآمدوں میں لوگ ایک دوسرے سے عید مل رہے تھے اور ہنس بول کر دل خوش کر رہے تھے - ۷ بجے سے ساڑھے ۷ بجے تک یہ جلسۂ ملاقات قائم رہا - جنوبی برآمدے کے سامنے والے میدان میں پُر تکلف کھانے میزوں پر چنے ہوئے تھے - وقت مقررہ پر کارکنانِ جلسہ نے مہمانوں سے استدعا کی کہ اب وہ میزوں کی طرف متوجہ ہوں - چنانچہ نہایت خندہ پیشانی سے یہ عرض قبول کی گئی اور تقریباً آٹھ بجے تک خوردونوش کا خوب لطف رہا -

ریفریشمنٹ کا کل سامان اس انجمن کے پریسیڈنٹ شیخ سیّد محمد صاحب کی علوِ ہمتی کا نتیجہ تھا -

۸ بجے کے بعد شمالی احاطے میں جلسۂ مشاعرہ منعقد کیا گیا - سید محفوظ علی صاحب بی - اے - (علیگ) ، جو بدایوں کے ایک قابل ادیب ہیں ، اس جلسے کے صدر قرار دیے گئے - یوں تو بدایوں میں ہر سال بے شمار جلسے شعر و سخن کے منعقد ہوتے رہے ہیں ، لیکن یہ جلسہ بدایوں کی تاریخ میں اپنی شان اور نوعیت میں ایک

نیا جلسہ تھا ۔ بدایوں کے شعرا آج تک اپنی اسی روش پر چل رہے تھے ، جس پر ایشیائی شاعر ہمیشہ فخر کرتے رہے ہیں ۔ لیکن زمانے نے اس روش کو عرصہ ہوا کہ اہلِ نظر کی روش سے گرا دیا ہے ۔ اس سے قبل ''ذوالقرنین'' اپنے مقامی شعرا کو اکثر مواقع پر زمانے کی روش کی طرف متوجہ کرتا رہا ہے جس کا عملی نتیجہ یہ عید کا مشاعرہ تھا ۔ اس موقع پر جن بزرگوں نے اس جدید طرز میں طبع آزمائی فرمائی تھی ، ان کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں اور یہ فہرست ہم نے حتی الامکان اسی ترتیب سے درج کی ہے جس ترتیب سے غزلیں پڑھی گئی تھیں :

(۱) مولوی امیر احمد صاحب امیر (ٹونک والے) ۔ (۲) حاجی عطا محمد صاحب عطا ۔ (۳) حکیم کفیل الدین صاحب عالی ۔ (۴) منشی قمرالحسن صاحب قمر ۔ (۵) منشی افضال احمد صاحب بسمل ۔ (۶) مولوی انصار حسین صاحب زلالی ۔ (۷) مولوی مجتہد الدین صاحب عیش ۔ (۸) حاجی عبدالجامع صاحب جامی ۔ (۹) مولوی ہبہ احمد صاحب (۱۰) منشی کاظم حسین صاحب مضطر ۔ (۱۱) منشی محمد معین صاحب نازش ۔ (۱۲) مولانا راغب جیلانی ۔ (۱۳) حکیم حسنین احمد صاحب مورخ ۔ (۱۴) منشی اکرام احمد صاحب شاد ۔ (۱۵) چودھری محمد ابراہیم صاحب خلیل ۔ (۱۶) قاضی غلام سجاد صاحب بسمل ۔ (۱۷) نظامی ۔

بعض خاص قطعات کے علاوہ تمام غزلیں مندرجہ ذیل طرح پر لکھی گئی تھیں :

اے دلِ پُر داغ بیتابی سے کچھ حاصل نہیں

ان غزلوں میں نہایت پاکیزہ خیالات نظم کیے گئے تھے ۔ ان مختصر

کالموں میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ ہم سب کو ایک وقت میں ہدیۂ ناظرین کر سکیں ۔ اس لیے وقتاً فوقتاً ہم اپنے ناظرین کے سامنے اس ادبی باغ کی ڈالی ''اردو ادب کی چاشنی'' کے ہیڈنگ کے ذیل میں سلسلہ وار پیش کرتے رہیں گے ۔

مشاعرہ ختم ہونے پر میجک لینٹرن دکھائی گئی ۔ یہ لینٹرن چودھری محمد صلاح الدین صاحب رئیسِ کھیڑہ نے خاص طور پر کلکتے سے منگوا کر کتب خانے کو عنایت فرمائی ہے ۔ چونکہ میجک لینٹرن کے لیے جگہ مناسب نہ تھی ، اس لیے بعض صاحب اس کا ملاحظہ نہ کر سکے ۔ آئندہ موقع پر اس کا لحاظ ضروری ہے ۔ ہم اس جلسے کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کارروائی پروگرام کے مطابق عمل میں آئی اور جلسہ وقتِ مقررہ پر شروع ہو کر تقریباً ساڑھے دس بجے ختم ہوگیا ۔ ہمیں امید ہے کہ آنے والی عید اضحیٰ کے موقع پر عید کا یہ جلسہ اس سے وسیع پیمانے پر اعلیٰ اہتمام کے ساتھ منعقد کیا جائے گا اور اہلِ شہر اس میں کافی دلچسپی لیں گے ۔ اس مشاعرے میں چونکہ پہلے غیر طرح نظمیں پڑھی گئی تھیں ، اس لیے قبل اس کے ہم طرح کی غزلوں کا انتخاب شائع کریں ، ہم غیر طرح نظمیں شائع کرتے ہیں ۔ (اس جگہ حاجی عطا محمد صاحب عطا وکیل بدایوں اور نظامی بدایونی کی نظمیں درج تھیں جو ہم نے ترک کر دی ہیں ـــ قریشی) ۔

اسی مشاعرے میں علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی کو بھی دعوت دی گئی تھی مگر وہ شرکت نہ کر سکے تھے اور ان کے قطعات ڈاک سے وصول ہوئے تھے جو اس اشاعت (''ذوالقرنین'' ۲۱ اگست ۱۹۱۵ع) میں شائع کیے جاتے ہیں :

از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب :

یہ شالامار[1] میں اک برگِ زرد کہتا تھا
گیا وہ موسمِ گل جس کا راز دار ہوں میں
نہ پائمال کریں مجھ کو زائرانِ چمن
انھیں کی شاخِ نشیمن کی یادگار ہوں میں
ذرا سے پتّے نے بے تاب کر دیا دل کو
چمن میں آ کے سراپا غمِ بہار ہوں میں
مجھے قسم ہے نظامی ! مدینے والے کی
ہمیشہ ماتمِ ملّت میں اشک بار ہوں میں
خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یادِ فصلِ بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں
اُجاڑ ہو گئے عہدِ کہن کے میخانے
گزشتہ بادہ پرستوں کی یارگار ہوں میں
سرودِ مرغِ نوا ریز و ہم نشینیِ گل
مرے نصیب کہاں ، غنچۂ مزار ہوں میں
پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

قطعۂ عید از جناب اکبر الہ آبادی :

خوش پھر رہی ہے خلقِ خدا ، صبحِ عید ہے
ہر سمت زیب و زینتِ دنیا کی عید ہے
بازارِ دہر پُر ہے متاعِ سرور سے
با منفعت فروخت ہے دل کش خرید ہے

۱۔ عہد مغلیہ کے دورِ عروج کی یادگار ، لاہور کا مشہور باغ جو بادشاہوں کی تفریح گاہ تھا ۔

صوفی کی انجمن میں بھی شاہی کا ہے سماں
لطفِ نوائے مُطرب و نذرِ مُرید ہے
مست اپنے رنگ میں ہیں نئی روشنی کے دوست
اظہارِ جوشِ طبع بطرزِ جدید ہے
جن کے سبوئے دل میں ہے کچھ مایۂ نشاط
اس سے شرابِ طولِ امل کی کشید ہے
ہے یونیورسٹی بھی الکشن بھی لیگ بھی
ہر سمت ایک خضر طریق اُمید ہے
مجھ کو خموش دیکھ کے پوچھا یہ چرخ نے
تو بھی اس آب و رنگ سے کچھ مستفید ہے
میں نے کہا کہ حالتِ عشّاق ہے کچھ اور
پروا نہ ہو وفا کی جنہیں سے اُمید ہے
پیشِ نظر ہمارے ہے شامِ شبِ فراق
اس کی سحر جو ہو تو ہماری بھی عید ہے"

مندرجہ بالا اقتباس پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اظہار و بیان کے اسلوب اور پیرائے الگ الگ ہونے کے باوجود جذبات سب کے ایک سے ہیں - یہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا - ترکی اور دیگر اسلامی ریاستوں پر آگ کے شعلے برس رہے تھے - مسلمان جہاں کہیں بھی آباد تھے، اپنے دینی بھائیوں کی بربادی کی لرزہ خیز داستانیں سن سن کر خون کے آنسو رو رہے تھے - اقبال بھی سوگوار تھے - ان کی یہ نظم انھی جذبات کی آئینہ دار ہے - جب یہ لکھی گئی تھی تو اُس وقت اس کے آٹھ شعر تھے - "بانگِ درا" کی

ترتیب کے وقت اس کے دو شعر ـــ چوتھا اور ساتواں ـــ حذف کر دیے گئے جس سے فرمائش کرنے والے کا نام نکل گیا اور نظم کا عنوان ایک معما بن کر رہ گیا جو آج تک کسی سے حل نہ ہو سکا۔ دیکھیے نظامی صاحب کو مخاطب کرکے کس دل سوزی سے اپنے غم و اندوہ اور تنہائی کا اظہار کرتے ہیں :

مجھے قسم ہے نظامی! مدینے والے کی
ہمیشہ ماتمِ ملّت میں اشک بار ہوں میں
سرودِ مرغِ نوا ریز و ہم نشینیِ گل
مرے نصیب کہاں، غنچۂ مزار ہوں میں[1]

علامہ اقبال کی یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ انھی دنوں اس پر تضمینوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بدایوں ہی کے ایک شاعر کی تضمین کے دو بند بطورِ نمونہ پیشِ خدمت ہیں:

وہ دین جس سے کہ بزمِ جہاں کی رونق تھی
ہزار حیف کہ مُردہ ہوا ہے جیتے جی
شریکِ غم نہ ہوں یہ ہے خلافِ ہمدردی
”مجھے قسم ہے نظامی، مدینے والے کی
ہمیشہ ماتمِ ملّت میں سوگوار ہوں میں“

وہ غم پسند ہے دل، غم سے چین پاتا ہے
خوشی کی باتوں سے منہ کو کلیجہ آتا ہے
یہ لطف دید ملاقات دل دُکھاتا ہے

۱۔ یہ دونوں شعر ”باقیاتِ اقبال“ (طبع دوم، ۱۹٦٦ء، ص ۲٦۹) میں محفوظ کردیے گئے ہیں۔

"پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے"[1]

(مجلہ اقبال لاہور
اپریل ۱۹۷۸ع)

• • •

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے۔

۱- مضمون بدر الحسن اختر بدایونی مطبوعہ "ڈان اردو"، کراچی
۲۲ اپریل ۱۹۵۰ع، ص ۷ -

بزمِ اقبال کی دوسری مطبوعات

۱- اقبال اور "ملا" : از خلیفہ عبدالحکیم - - -	۰/۷۵
۲- مکاتیبِ اقبال : بنام خان نیازالدین خان مرحوم -	۱/۲۵
۳- تقاریر یومِ اقبال : (۱۹۵۴ء) مرتبہ بزمِ اقبال -	۱/۲۵
۴- علامہ اقبال : (آقائے مجتبیٰ کی کتاب 'اقبال لاہوری' کا اُردو ترجمہ) از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم - - - - -	۱/۵۰
۵- ذکرِ اقبال : از مولانا عبدالمجید سالک - - -	۵/۰۰
۶- منشوراتِ اقبال : (علامہ پر چند نشری تقاریر کا مجموعہ)	۲/۰۰
۷- فکرِ اقبال : از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - - -	۱۵/۰۰
۸- فلسفۂ اقبال : مرتبہ بزمِ اقبال - - -	۶/۰۰
۹- قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے سیاسی نظریے : مرتبہ بزمِ اقبال - - - - - -	۴/۰۰
۱۰- شعرِ اقبال : از سید عابد علی عابد - - -	۷/۵۰
۱۱- مطالعۂ اقبال : مرتبہ گوہر نوشاہی - - -	۱۵/۰۰
۱۲- اقبال درونِ خانہ : مؤلفہ خالد نذیر صوفی - -	۱۰/۰۰
۱۳- ایران نامہ : مرتبہ گوہر نوشاہی - - -	۱۲/۰۰
۱۴- نذرِ اقبال : مرتبہ محمد حنیف شاہد - - -	۷/۰۰
۱۵- اقبال دیاں لمیاں نظماں (منظوم پنجابی ترجمہ) : از خلیل آتش - - - - - -	۱۰/۰۰
۱۶- اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں : مرتبہ پروفیسر اختر راہی - - - -	۲۰/۰۰
۱۷- اقبال کی شخصیت اور شاعری : از پروفیسر حمید احمد خاں - - - -	۱۰/۰۰
۱۸- اقبال کا فنی ارتقا : مؤلفہ پروفیسر جابر علی سید -	۱۳/۰۰
۱۹- علم الاقتصاد : پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی	۲۰/۰۱

بزمِ اقبال - کلب روڈ - لاہور